وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟
اس شخص کا واقعہ جسکا ماضی گم ہو گیا تھا
اور سازشوں نے جس کے گرد جال بن دیا تھا
اگر آپ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آئے تو؟

شہر اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ ان سڑکوں، بازاروں اور گلیوں سے پہلے بھی گزرا تھا۔ وہ چوک جہاں ہر سمت سے آنے والی کاروں کی قطاریں ایک شاندار فوارے کے گرد گھوم کر جا رہی تھیں اس نے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن وہ راستہ جو اسے اپنے گھر تک پہنچا سکتا تھا نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو کسی راہگیر سے یا کسی ٹریفک کے سپاہی سے راستہ پوچھ سکتا تھا مگر اس میں مزید تماشہ بننے کی ہمت نہ تھی۔ یوں ہی اس کا حلیہ دیوانوں جیسا ہو رہا تھا۔ کپڑے بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے اور بدن سے ایسی

بو اٹھ رہی تھی جیسے وہ گٹر کے غلیظ پانی میں غوطہ لگا کے نکلا ہے۔
ایک دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے شیشے میں اس نے اپنی صورت دیکھی تھی تو وہ خود کو نہ پہچان سکا تھا۔ اسکی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر داغ ہی داغ تھے، خراشوں کے اور نیل کے اور میل کے۔ یوں جیسے اس نے ہفتہ بھر کسی گیراج میں کام کیا ہے اور ایک بار بھی منہ نہیں دھویا۔ اب اگر وہ کسی سے کہتا کہ مجھے میرا نام اور میرے گھر کا پتا بتا دو تو شاید ایک مجمع اکٹھا ہو جاتا اور لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے، معلوم ہوتا ہے بہت پی لی ہے۔ کہتا ہے کہ میرا نام کیا ہے۔ میں رہتا کہاں ہوں۔ پاگل کا بچہ۔

سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا۔ اگر اسے صرف اتنا یاد آ جاتا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے تو اس کے سارے مسئلے حل ہو سکتے تھے لیکن اس کے ذہن میں صرف دھند تھی، شاید یہ نشے کی کیفیت کا اثر تھا یا پھر کوئی اور بات تھی، لیکن اسے یقین تھا کہ بالآخر یہ دھند چھٹ جائے گی۔ بظاہر اس یقین کا جواز بھی نہ تھا مگر اسے یوں لگتا تھا جیسے بات صرف ایک لمحے کی ہے پھر حقیقت اچانک واضح ہو جائے گی۔ اسے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ بہت سی باتیں اب بھی وہ جانتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کی گھڑی میں پانچ بجکر سینتیس منٹ ہوئے ہیں لیکن گھڑی بند پڑی ہے۔ صحیح وقت اسے سامنے ایک شوکیس میں لگے ہوئے کلاک کی سوئیاں بتا رہی تھیں۔ صبح کے پونے گیارہ بجے تھے۔ تاریخ نہ جانے کیا تھی اور مہینہ خدا معلوم کون سا تھا اور نہ جانے کون سا برس تھا یہ؟

بازار میں بڑی چہل پہل تھی۔ وہ ایک سنیما کے سامنے سے گزرا اور سڑک کے دوسرے کنارے سے فلم کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر دیکھتا رہا۔ "جمعہ ۲۱ جنوری سے تہلکہ خیز افتتاح۔" اس نے ایک پوسٹر پر پڑھا جسکے اوپر لکھا ہوا تھا "آئندہ پروگرام"۔ خوب اس نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ مہینہ جنوری کا ہے اور ۲۱ تاریخ ابھی نہیں آئی۔ نیا سال شروع ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے، لیکن کون سا نیا سال؟

فرنیچر کی ایک بہت بڑی دکان کے ساتھ چھوٹا سا ریستوران دیکھ کر اسکی بھوک اچانک جاگ اٹھی۔ وہ سوچے سمجھے بغیر سڑک پار کر کے ریستوران میں داخل ہو گیا۔ یہ خیال اسے آرڈر دینے کے بعد آیا کہ کہیں اسکی جیب خالی نہ ہو۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں گیا اور جب اندر سے چمڑے کا سیاہ پرس برآمد ہوا تو اسے یوں لگا جیسے اپنے گم گشتہ وجود کا سراغ مل گیا ہے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے پرس کے اندر سے ہر چیز نکال کر میز پر ڈال دی۔ دس دس کے چار نوٹ۔ سو سو کے دو۔ پچاس کا ایک۔ کچھ چھوٹے نوٹ۔ مجموعی رقم تقریباً تین سو روپے۔ اس نے اطمینان کا پہلا سانس لیا۔ پھر اس نے ڈرائیونگ لائسنس دیکھا۔ ندیم شہزاد۔ نو سو ننانوے ڈی۔ "قصرِ اعظم" نارتھ ناظم آباد۔ تاریخ اجرا ۱۴ جنوری ۱۹۷۲ء۔ لائسنس پر دستخط شاید اسکے ہی تھے۔ پرس میں حبیب بنک کا کریڈٹ کارڈ تھا۔ عزیز ٹیلرز کی ایک رسید تھی جس پر چودہ جنوری کی تاریخ تھی۔ پانی میں بھیگنے سے رسید کا آخری کونا پھٹ گیا تھا چنانچہ اسے سال کا بھی علم نہ ہو سکا۔ اس نے کوئی سوٹ سلنے کو دیا تھا جو اسے ٹھیک ایک مہینے بعد لینا تھا اور ۲۱ جنوری کی تاریخ اگر نہیں آئی تھی تو ۱۴ فروری یقیناً بہت دور تھی۔ اس نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی مگر اسے سوٹ کے کپڑے کا رنگ بالکل یاد نہ آیا۔

اس نے اپنے سوٹ کو دیکھا جو اب خشک ہو رہا تھا اور اسکی شکنیں خود بخود غائب ہو رہی تھیں۔ کپڑا خاصا قیمتی تھا اور سلائی یقیناً بہت عمدہ تھی۔ قمیض ابھی تک گیلی تھی لیکن معمولی قیمت کی نہ تھی۔ اسکی نگاہ اپنے جوتوں پر گئی جو بھیگ کر بدوضع ہو گئے تھے مگر پرانے نہیں تھے۔ اپنے بارے میں اتنی معلومات حاصل ہو جانے سے اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ اس نے تمام چیزوں کو بڑی احتیاط سے واپس پرس میں رکھا۔

اگر وہ ندیم شہزاد ہے اور نارتھ ناظم آباد کے "قصرِ اعظم" میں رہتا ہے تو اب اس کے لئے گھر پہنچنا آسان ہے۔ اس نے طے کیا۔ پھر اسے گھر کے دیگر مکینوں کا خیال آیا۔ یہ مزید پریشانی کی بات تھی۔ آخر وہاں اور کون رہتا ہے؟ اس کا ان سب سے کیا رشتہ ہے؟ اگر اس کے ماں باپ یا بھائی بہن موجود ہیں یا اسکے اپنے بیوی بچے "اعظم ہاؤس" میں رہتے ہیں تو کیا وہ اس کے لئے پریشان نہیں؟ انہوں نے اس کو تلاش نہیں کیا؟ نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اکثر اسی کیفیت کا شکار ہو کے کھو جاتا ہے — اور پھر گھر پہنچ جاتا ہے یا اسے ابھی گھر سے نکلے ہوئے اتنا وقت ہی نہیں ہوا کہ وہ لوگ تشویش میں مبتلا ہوں؟ سوال یہ بھی تھا کہ اپنے بارے میں اسکی یہ معلومات غلط ہوئیں تو کیا ہو گا مگر چائے آ جانے کے بعد وہ سب کچھ بھول گیا اور جو کچھ اس کے سامنے آیا صاف کر گیا۔ جب وہ بل ادا کرنے اٹھا تو تھکن کا جسمانی احساس بہت حد تک کم ہو چکا تھا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایرانی نے بٹن دبا کر گھنٹی بجائی اور اسے غور سے دیکھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی ٹائی ٹھیک کی جو ڈھیلی ہو کر لٹک گئی تھی اور پریشان بالوں کو انگلیوں سے سنوارنے کی کوشش کی جو سر سے چپکے ہوئے تھے۔ "ساڑھے پانچ روپے۔" مختصر سے ہال کے دوسرے کنارے سے بیرے نے چیخ کر کہا۔ اس نے دس کا ایک نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ایرانی نے بھیگے ہوئے نوٹ کو دیکھ کر منہ بنایا مگر کچھ کہے بغیر باقی رقم اس کے سامنے ڈال

دی۔ اسی وقت اس نے ایرانی کے پیچھے دیوار پر لٹکا ہوا نئے سال کا کیلنڈر دیکھا۔ ٹائلٹ سوپ بنانے والی ایک کمپنی کا کیلنڈر جس پر ایک فلمسٹار کی رنگین اور نیم عریاں تصویر تھی۔ ۱۹۷۷ء کا کیلنڈر تھا۔

"اعظم ہاؤس۔" اس نے باہر آکے سوچا۔ آخر ندیم شہزاد کا اعظم ہاؤس سے کیا تعلق ہے؟ اعظم کون ہے؟ اس کا باپ جس نے یہ گھر بنایا تھا؟ یا اس کا بیٹا جس کے نام پر خود اس نے یہ مکان تعمیر کیا تھا؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مکان کا مالک کوئی اور ہو اور وہ اس میں کرائے پر رہتا ہو۔ اس نے پبلک ٹیلی فون سے یہ معلوم کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہاں اگر فون ہے تو اس کا نمبر کیا ہے۔ پھر وہ ایک ڈاکخانے میں داخل ہوا جس کی پیشانی پر "صدر پوسٹ آفس" لکھا ہوا تھا۔ وہاں سے اس نے ۱۷ ڈائل کیا۔

"ندیم شہزاد۔؟" آپریٹر نے کہا۔ "سوری سر، اس نام سے کوئی فون نہیں۔"

"اچھا۔؟" اس نے کہا۔ "اعظم ہاؤس۔ نارتھ ناظم آباد۔"

آپریٹر نے فوراً اسے تین نمبر بتادیئے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ نمبر اسے ازبر ہیں۔

اس نے ایک نمبر ملایا۔

"اعظم ہاؤس۔" اس نے ایک دوسری طرف سے مرد کی آواز سنی۔ بھاری۔ کرخت پر اعتماد آواز۔

"ہیلو۔" اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اور کیا کہے۔ "ہیلو۔" اس نے دوبارہ کہا۔

"ندیم۔؟" اعظم ہاؤس سے بولنے والے نے چلا کر کہا۔ "ندیم یہ تم بول رہے ہو۔؟"

"ہاں...." اس نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کہا۔ "تم کون ہو۔؟"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ میں گوہر ہوں اور کون ہوں۔ مجھے بتاؤ تم بول کہاں سے رہے ہو۔ اور اب تک کہاں تھے؟"

"میں۔ میں صدر پوسٹ آفس سے بول رہا ہوں۔" اس نے محسوس کیا کہ سوال کے دوسرے حصے کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔

"اچھا ٹھہرو۔ باجی سے بات کرو۔" گوہر نے چیخ کر کسی کو آواز دی جو فون پر بھی صاف سنائی دی۔ "شاہینہ باجی کو بلاؤ۔ جلدی۔ کہو ندیم کا فون ہے۔" وہ پھر اس سے مخاطب ہوگیا۔ "دیکھو باجی سے ذرا سوچ سمجھ کے بات کرنا تم جیسے شوہروں پر تو سبھی بیویاں شک کرتی ہیں مگر میری بہن شاہینہ اس معاملے میں بہت حساس ہے۔ یہ تم جانتے ہی ہو۔"

ایک رنگروٹ چھٹی مانگ رہا تھا اور اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ آخر اس نے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا۔ "حضور۔ میری بیوی مجھے بہت یاد کرتی ہے۔ وہ بیمار ہوگئی ہے اور اگر میں نہ پہنچا تو مرجائے گی۔"

"فرض زیادہ اہم ہے یا بیوی؟" کمانڈنگ افسر نے ڈانٹ کر کہا۔ "تم چھٹی پر چلے جاؤ گے تو ملک کا دفاع کون کرے گا؟"

"حضور۔ ملک کے دفاع کے لئے پانچ لاکھ جوان موجود ہیں۔ مگر اپنی بیوی کا دفاع تو صرف میں ہی کرسکتا ہوں۔" رنگروٹ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"کیا مطلب۔" ندیم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ لڑکی ہسپتال میں ہے۔" گوہر نے برہمی سے کہا۔ "لیکن وہ ابھی اپنے ہوش میں نہیں ہے اور ہوش میں آنے کے بعد اگر اس نے کوئی غلط قسم کا بیان دے دیا تو کیا ہوگا۔ کیا ڈیڈی اس رسوائی کو برداشت کرسکیں گے۔"

اسے جواب دینے کا موقع نہ ملا۔ اس نے کسی عورت کی آواز سنی۔ "ندیم۔" اس کے لہجے میں گھبراہٹ سے زیادہ ناراضگی تھی۔

"ہاں۔" اس نے اقرار کیا۔ اب تک وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اعظم ہاؤس میں کم سے کم تین افراد ہیں۔ اس کا سالا گوہر۔ اس کی بیوی شاہینہ اور ان دونوں کا باپ یعنی اس کا خسر۔ لیکن کسی لڑکی کے ہسپتال میں بے ہوش ہونے اور اس معاملے میں رسوائی سے اسکے خسر کی جان کو خطرہ لاحق ہونے والی بات اسکی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"فون کیوں کیا ہے۔" شاہینہ بولی۔ "گھر کیوں نہیں آئے؟"

"گھر۔؟" وہ سوچ کر بولا۔ "کیسے آؤں۔؟"

"کیوں؟ زخمی ہو۔ یا زیادہ پی کر گھر کا راستہ بھی بھول گئے ہو۔ دیکھو ندیم۔ تم نے جو چکر چلایا ہے نا اس سے پورے خاندان کی بدنامی ہوئی ہے۔"

"کیسا چکر شاہینہ۔" اس نے ہمت کرکے بیوی کا نام لیا۔ "خدا کی قسم۔"

"جھوٹی قسمیں مت کھاؤ۔" وہ چلاکر بولی۔ "میرے کان پک گئے ہیں دس برس سے تمہارے جھوٹ سنتے سنتے۔ شرم تو تمہیں آتی نہیں۔ چوبیس گھنٹے بعد بھی سیدھے گھر آنے کی بجائے نواب صاحب فون پر بات کررہے ہیں۔ اگر بیوی کا خیال نہیں تو کیا تمہیں اپنے بچے کا خیال بھی نہیں۔ کیا اثر ہوگا اس پر جب وہ تمہارے اس کارنامے کی شہرت سنے گا۔ وہ اتنا چھوٹا بچہ تو نہیں۔ نو برس کا بچہ سب سمجھتا ہے۔ اور ڈیڈی کا کیا ہوگا۔ کیا اس بیماری میں وہ اتنا بڑا اسکینڈل برداشت کرسکیں گے۔" وہ اب رو رہی تھی۔

وہ ہکابکا سب سن رہا تھا۔ "شاہینہ۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"مر گئی شاہینہ۔" وہ چیخ کر بولی۔ "اگر میں تمہاری غیر حاضری کے چوبیس گھنٹے بعد "شاہی" سے "شاہینہ" ہوگئی ہوں تو تم بھی میرے شوہر نہیں رہے۔"

"شاہینہ۔" گوہر نے اسکے ہاتھ سے فون لے لیا۔ "پاگل مت بنو۔ یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں۔ وہ شاید نشے میں ہوگا۔ میں اسے جا کے لے آتا ہوں۔" اس نے سنا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوا۔ "ندیم۔ میں گاڑی لے کر آ رہا ہوں۔ تم وہیں انتظار کرو میرا۔ صدر پوسٹ آفس میں۔ اور دیکھو۔ اگر تم سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرے تو اسے کچھ مت بتانا۔ سمجھے؟ زبان سے ایک لفظ نکالنے کی ضرورت نہیں ورنہ ہم سب مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ وکیل سے مشورہ کئے بغیر کچھ نہیں کہنا ہے۔" فون بند ہوگیا۔

وہ فون بوتھ سے نکل کر ان لوگوں کے درمیان کھڑا ہوگیا جو مختلف کاؤنٹروں پر لائنیں بنائے کھڑے تھے۔ صورت حال بڑی عجیب ہوگئی تھی۔ اسے اپنا نام معلوم ہوگیا تھا۔ گھر، بیوی، بچے سب مل گئے تھے۔ اسکا سالا گاڑی لے کر اسے ہمراہ لے جانے کے لئے آ رہا تھا مگر وہ سخت الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔ آخر گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے بارے میں وہ کسی کو کیا بتائے گا۔ یقیناً اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہے جو سب کے لئے بدنامی اور پریشانی کا سبب ہے۔ شاید اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ مگر کیا۔ کسی لڑکی کے اغوا یا قتل کی کوشش؟ معاملہ قانونی نوعیت کا ہے جب ہی تو اسکے سالے نے کہا ہے کہ وکیل سے مشورہ کئے بغیر کسی سے ایک لفظ نہیں کہنا۔ لاحول ولا قوۃ کون کہہ سکتا ہے میں نشے میں ہوں۔ مگر اسکے سالے کا تو یہی خیال تھا۔ اور اسکی بیوی نے شاہینہ کہنے کا برا مانا تھا۔ شاید وہ اسے 'شاہی' کہتا تھا۔ اگر وہ لڑکے کا نام بھی بتا دیتی تو۔ خیر۔ اب اتنے بہت سے سوالات کا جواب مل گیا ہے تو یہ بھی پتا چل ہی جائے گا۔ بھاگنے سے اب کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ کسی قانونی مشکل میں پھنسا ہوا ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ وہ لڑکی۔ خدا جانے وہ کون ہے۔ وہ ہوش میں آتے ہی نہ جانے کیا کہے گی اور وہ پکڑا جائے گا۔ اسکا سالا اور اس کی بیوی اسے بچا سکتے ہیں۔ وہ اپنی بدنامی سے ڈرے ہوئے ہیں۔ انہیں اس صدمے سے اپنے باپ کے مرنے کا بھی خوف ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اسکی بیوی کا اور اس کے سالے کا رویہ بڑا توہین آمیز تھا۔ کہیں یہ تو نہیں کہ وہ گھر داماد ہونے کی وجہ سے اسکی عزت نہ کرتے ہوں۔

اعظم ہاؤس شاید اسکے بیمار سسر کی ملکیت ہے۔ یہ تو اسے قطعی یاد نہ تھا کہ وہ شرابی کبابی قسم کا شخص تھا یا بدچلن اور آوارہ تھا۔ اگر یہ بات ہوتی تو کیا اس کا دل اب تک طلب کے باعث پینے کو نہ چاہتا۔ اتنی دیر میں اسنے کسی عورت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ذہنی طور پر وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس قماش کا آدمی ہرگز نہیں۔ وہ پوسٹ آفس سے باہر نکل آیا۔ ایک لمبی سی کار اسکے سامنے فٹ پاتھ کے کنارے آکھڑی ہوئی اور کسی نے زور سے ہارن بجایا۔ وہ اچھل پڑا۔ "ندیم۔" کسی نے سر نکال کے کہا۔ "یہاں کیوں کھڑے ہو۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔"

وہ آگے بڑھا۔ "تم..... تم گوہر ہو؟" اس نے پوچھا۔ پھر اسکی نظر اس شخص کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی پر گئی۔

کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے قہقہہ مارا۔ "پھر آؤٹ ہو گیا۔ بھائی میں سلطان ہوں۔ تمہارا بچپن کا دوست۔ کلاس فیلو۔"

"اوہ۔" وہ خفت سے مسکرایا۔ مزید کچھ کہنے سے پہلے اسکی نگاہ سامنے والی دکان کے سائن بورڈ پر پڑ گئی جہاں ایک عورت بڑے انداز دلربائی سے ساڑھی کا رنگین آنچل تھامے کھڑی تھی۔ اور سائن بورڈ پر لکھا تھا "اعظم سلک۔ رنگِ گل۔ حسنِ بہار۔" اعظم سلک؟ اعظم ہاؤس؟ جہاں بیک وقت تین ٹیلی فون ہیں۔

"کس چکر میں ہو؟" سلطان نے کہا اور اسے آنکھ ماری۔ نہایت فحش انداز میں۔

"میں گوہر کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"اوکے۔ عیش کرو۔" سلطان نے اسے پھر آنکھ ماری اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کی ران میں چٹکی لی۔ لڑکی تلملائی۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ "ابھی مجھ سے پوچھ رہا تھا گوہر ہو۔" سلطان نے ہنس کر لڑکی سے کہا۔ پھر گاڑی بڑھ گئی۔ ندیم کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ سب لوگ اسکی بے بسی سے فائدہ اٹھا کے اسکا مذاق اڑانے پر آمادہ تھے۔

دوسری گاڑی تقریباً اسی وقت اسکے سامنے آ کر رکی۔ "بیٹھو۔" کسی نے دروازہ کھول کے کہا۔ لہجے کا تحکمانہ انداز اسے پھر برا لگا مگر وہ آواز پہچان کے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سفید رنگ کی یہ مرسیڈیز بھی اسے جانی پہچانی لگی جو بالکل بے آواز تھی۔ کسی کشتی کی مانند شہر کی سڑکوں پر تیر رہی تھی۔ نام اسے یاد نہ تھے مگر وہ سب علاقے اس کے دیکھے ہوئے تھے اور اسے لگتا تھا وہ ان راستوں سے گزرتا رہا ہے۔ نہ جانے کب۔ پرہجوم بازار ختم ہوگیا اور شہر کا

کشادہ علاقہ شروع ہوگیا۔ وہ خاموشی سے اپنے سامنے دیکھتا رہا گوہر نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ ندیم نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ تیس برس کا نوجوان ہے ــــ اس کا سوٹ خاصا قیمتی تھا۔ کار لمحہ بھر کے لئے ایک عظیم الشان عمارت کے آہنی دروازے پر رکی۔ پھر چوکیدار نے گیٹ کھول کر سلام کیا اور گاڑی باغ کی درمیانی روش سے گزر کر پورچ میں کھڑی ہوگئی۔

❁

اس کی صورت کا دھندلا سا تصور بھی ندیم کے ذہن میں نہ تھا مگر وہ اندر آئی تو اس نے سمجھ لیا کہ وہ شاہینہ کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس کے انداز و اطوار میں وہ اعتماد تھا اور شکایت کا وہ اظہار تھا جو کسی بھی بیوی کی ذات میں کسی بھی شوہر کو محسوس ہو سکتا ہے۔ جب اسنے بات کی تو وہ اس آواز کو پہچان گیا جو اس نے کچھ دیر قبل ٹیلی فون پر سنی تھی۔ "یہاں کیوں کھڑے ہو؟ جاکر نہاتے کیوں نہیں؟" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "نوکر دیکھیں گے اس حلیے میں تو باتیں بنائیں گے!" اسکے بال گیلے تھے جنہیں وہ ہیئر ڈرائیر سے خشک کر رہی تھی۔

"شاہی!" اس نے ہمت کر کے کہا۔ "نوکروں کی باتوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ کیا تم مجھ سے خفا ہو؟"

اپنی بیوی کی صورت پر اسے حیرت کے آثار نظر آئے۔ پھر اسے لگا کہ وہ ابھی رو پڑے گی۔ "ان باتوں سے کیا حاصل ندیم!" وہ اپنے آپ پر قابو پاکے بولی۔ "ڈیڈی آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہیں دو بار پوچھ چکے ہیں' وہ سن نہیں سکتے ورنہ پھوپھی رشیدہ نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہوتا۔ مگر انہوں نے اپنے داماد کو یہ مجذوبوں جیسا حلیہ بنائے دیکھا تو کیا انہیں صدمہ نہ ہوگا؟"

وہ پوچھنا چاہتا کہ آخر اس کا جرم کیا ہے مگر فوری طور پر اسے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اسے یہ گھر ہی نہیں اسکے مکین بھی اجنبی اور نامانوس نظر آتے تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کے اندر آیا تھا تو دروازہ ایک خادم نے کھولا تھا اور وہ اندر پہنچا تھا تو اسے اپنے سامنے ایک کوریڈور سا نظر آیا تھا جس میں دونوں طرف دروازوں کی قطار تھی۔ سارے دروازے بند تھے مگر اسکی مشکل ایک اور خادم نے آسان کر دی۔ اس نے آگے بڑھ کے ایک دروازہ کھول دیا اور وہ سوچے سمجھے بغیر اس کمرے میں داخل ہوگیا جو سامان آرائش سے خوابگاہ نظر آتا تھا۔ کمرہ ایرکنڈیشنڈ تھا۔ فرش پر بچھا ہوا قالین بہت قیمتی تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے پردے بہت قیمتی تھے۔ کمرے کا سارا فرنیچر بہت قیمتی تھا لیکن اسے کوئی بھی چیز پہلے سے دیکھی ہوئی نہ لگتی تھی۔ اگر اسکی بیوی باتھ روم سے برآمد نہ ہوتی تو شاید اسے ہر پردہ ہٹاکے باتھ روم کا دروازہ تلاش کرنا پڑتا پھر اسکی بیوی نے ہیئر ڈرائیر بند کیا اور ایک الماری کھولی تو اسے وارڈروب میں بہت سے مردانہ سوٹ دکھائی دیئے اور اس نے اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ ٹھیک ہے۔ اسے پہلے اپنا حلیہ درست کرلینا چاہیئے جو سب ہی کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ غسل سے اسکی تھکن دور ہوجائے گی۔ پھر شاید اس کا ذہن کچھ یاد کر سکے۔ اسنے سوچا۔

شاہینہ اپنے لئے کپڑے نکال کر وارڈروب بند کرنے ہی والی تھی کہ وہ آگے بڑھا۔ "میرے کپڑے بھی نکال دو۔" اس نے خود بھی محسوس کیا کہ اسکا لہجہ تحکمانہ ہے۔ شاہینہ نے پلٹ کر اسے حیرت سے دیکھا مگر زبان سے کچھ کہے بغیر ہینگر میں لٹکے ہوئے بہت سے کپڑوں میں سے ایک سوٹ اسے نکال دیا۔ پھر نیچے کے خانے سے ایک قمیض اور ٹائی نکالی۔ وہ سب کچھ لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ شیو کرتے ہوئے اور نہاتے ہوئے وہ اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے سب لوگوں کے نام اور ان سے اپنے رشتے معلوم ہورہے تھے لیکن یہ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ سب اسے پہچانتے تھے اور وہ کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا وہ کسی حادثے میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے؟ یا نہیں۔ اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ غلط فہمی کا کوئی سوال نہیں۔ پہچاننے والوں نے اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ اور ان سب کے علاوہ جو اس گھر کے اندر رہتے تھے اسے ایک اجنبی بھی ملا تھا۔ اسکا پرانا کلاس فیلو۔ کیا اسے بھی غلط فہمی ہوئی تھی اور پھر شکل و صورت کی شباہت سے دنیا دھوکہ کھا سکتی ہے مگر بیوی نہیں۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوگیا ہو؟ اگر یہ چند افراد اسے یقین دلانے پر مصر ہوں کہ وہ ندیم شہزاد ہے تو وہ اصل ندیم شہزاد کہاں گیا؟ اگر اسے اغوا یا قتل کیا گیا ہے تو جب تک اسکی اپنی یادداشت نہ لوٹ آئے وہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ وہ ندیم شہزاد نہیں۔ اصل ندیم شہزاد کا پتہ لگانا تو بعید از قیاس بات ہے۔

آہستہ آہستہ یہ خیال اسکے ذہن میں جڑ پکڑنے لگا۔ یقیناً یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہے۔ آخر وہ کیسے مان لے کہ اسے شہر اور شہر کی سڑکیں اور بازار اور گلی کوچے تو آشنا لگتے ہیں مگر وہ مکان نہیں جہاں اس نے کم سے کم دس برس کی ازدواجی زندگی بسر کی ہے وہ ان لوگوں کے چہرے کیوں نہیں پہچانتا جو اسکے قریب رہے؟ اسکی یادداشت یقیناً متاثر ہوئی ہے مگر اسکا ذہنی توازن نہیں بگڑا ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے اور اس کی

قوت فیصلہ برقرار ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سازش کے امکانات کو یکسر مسترد کرنا ممکن نہیں۔ اگر اصل شخص مارا گیا ہے یا غائب ہے تو اسے ندیم شہزاد بنانے والے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مقصد کچھ بھی ہو۔ جرم کی پردہ پوشی یا کسی مالی نقصان سے تحفظ۔ کسی کاروباری معاملے میں اسکی مدد سے فریب یا جعلسازی کی کوشش۔ اسے آلۂ کار بنا کے کسی فراڈ میں ملوث کر دینے کا پروگرام۔ اس نے طے کیا کہ اصل حقیقت کا علم ہونے تک اسے محتاط رہنا ہوگا۔ محض ان کاغذات پر جو اسکی جیب سے نکلے یا ان لوگوں کی باتوں پر جو اسکے آس پاس جمع تھے۔ بھروسہ کر کے خود کو ندیم شہزاد مان لینا غلط ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ اسے ندیم شہزاد بنانے والے اپنا مطلب نکال کر پھر اصل ندیم شہزاد کو اس کی جگہ لے آئیں اور اسکا وجود ذہنی لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹا دیں۔ بڑے جوڑے کاروبار اور دھن دولت کے معاملات میں کیا نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ کیسے اعتبار کرے کہ اسے اپنا شوہر کہنے والی عورت واقعی اسکی بیوی ہے اور وہ دوسرا شخص اسکا بھائی ہے جو اسے یہاں لے آیا ہے۔ اپنے سسر اور پھوپھی رشیدہ کو تو اس نے دیکھا بھی نہیں۔

اسے اپنے ندیم شہزاد نہ ہونے کا سب سے زیادہ یقین یوں آیا کہ وہ ایک قطعی مختلف شخص تھا۔ یہ لوگ اسکے ساتھ جو تحقیر آمیز سلوک کر رہے تھے وہ اسے سخت گراں گزر رہا تھا۔ اسے تو اپنا گھر داماد ہونا بھی معیوب اور باعث تذلیل لگ رہا تھا۔ جبکہ اصل ندیم شہزاد غالباً ان باتوں کا عادی تھا۔ وہ شرابی تھا اور بدچلن تھا اور قوت فیصلہ سے محروم تھا اور اتنی کمزور شخصیت کا مالک تھا کہ باقی لوگ اس پر حاوی تھے۔ وہ خود ہرگز ایسا نہ تھا۔ یہ بات وہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ندیم شہزاد کا سراغ لگانے کے لئے "اعظم ہاؤس" میں ضرور رہے گا۔ جب وہ باتھ روم سے نکلا تو نہ صرف یہ کہ اسکی ظاہری صورت بالکل بدل گئی تھی بلکہ وہ ذہنی طور پر بھی پوری طرح مستعد اور ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ اسکی بیوی اسکا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کا لباس اور میک اپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے تعجب ہوا کہ اس عورت کے حسن کا احساس اسے پہلے کیوں نہ ہوا۔ وہ اپنی زبان سے ایک ایسی بات کہتے کہتے رک گیا جو اسے شوہر کی حیثیت سے کہنے کا حق پہنچتا تھا کیونکہ کمرے میں ایک اور عورت بھی موجود تھی جس نے ساڑھی بھی سفید باندھ رکھی تھی اور اسکے سر کے بال بھی سفید تھے۔ وہ جملہ اس نے اسلئے بھی نہیں کہا تھا کہ ابتداً سے اس نے اپنی بیوی کے رویے میں ایک طرح کی سرد مہری کو محسوس کیا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور کم گو لگتی تھی۔ یوں جیسے وہ اس سے خفا ہے لیکن اس خفگی میں محبت سے زیادہ نفرت غالب ہے۔ چنانچہ اس نے بیوی کو نظر انداز کر کے اس بوڑھی عورت کو غور سے دیکھا جو اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ پھوپھی رشیدہ۔ اس نے طے کیا اور ہاتھ اٹھا کے اسے سلام کر لیا۔ اسے حیرت ہوئی جب اسکے سلام پر دونوں عورتوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا "خدا خوش رکھے بیٹا" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔ "گھر سے ایک دن باہر رہ کر بڑوں کو سلام کرنا تو سیکھا"

بیوی نے ناگواری سے اسکی طرف دیکھا۔ "ان سے یہ پوچھئے کہ یہ تھے کہاں؟" وہ ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"میں؟" اس نے سوچ کر کہا۔ "میں یہیں تھا... یہیں۔ میرا مطلب ہے کراچی میں..."

"یہیں تھے تو تمہاری کار کہاں ہے؟ اور تمہارے کپڑوں کی یہ حالت کیسے ہوئی جیسے تم کپڑوں سمیت سمندر میں نہاتے رہے ہو اور تمہاری صورت سے پتا چلتا تھا کہ تم کسی سے لڑ کر آئے ہو" شاہینہ رسالہ پٹختے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

کار؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ کیا وہ کسی کار میں گھر سے روانہ ہوا تھا۔ کون سی کار تھی وہ؟

"شاہینہ" اسکی پھوپھی کی آواز سنائی دی۔ "اسے دم تو لینے دو۔ دیکھتی نہیں ہو اسکی کیا حالت ہو رہی ہے۔ چلو پہلے کھانا کھا لو" مگر شاہینہ اسکی بات مکمل ہونے سے قبل ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ پھوپھی رشیدہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ "اعظم کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے بیٹا" پھوپھی رشیدہ نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھے چلتے چلتے کہا۔ "اس کی زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اسے سکون سے مرنے دو" وہ خاموشی سے چلتا رہا۔

"اسے تمہاری طرف سے دکھ پہنچا ہے۔ وہ سنتا نہیں بولتا نہیں تو کیا۔ دیکھتا تو سب کچھ ہے" وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ "ایک منٹ اسکی طبیعت کا حال پوچھ لو بیٹا۔ تم تو ہفتہ ہفتہ اسکی خبر ہی نہیں لیتے۔"

اس نے اندازہ لگایا کہ وہ جس کمرے کے دروازے پر رکی ہے وہ اسکے بھائی اعظم کا ہو سکتا ہے۔ ہمت کر کے اس نے ڈور لاک کو گھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں ہسپتال کے کمرے جیسی بو تھی۔ کھڑکی سے ایک شخص باہر دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ معذوروں کی ایک کرسی پر تھے۔ بائیں طرف نرس کھڑی تھی۔ باہر جھانکنے والا شخص اپنے حلیے سے ڈاکٹر لگتا تھا۔ اسکے گلے میں ایک اسٹیتھسکوپ تھا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سن کر اس نے پیچھے دیکھا "ندیم صاحب" اس نے شائستگی سے کہا اور کرسی کا رخ پلٹ

کرسی کی طرف کر دیا۔

ندیم کے سامنے اب اس کرسی پر ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جس کے سر کے، پلکوں اور بھنوؤں کے تمام بالوں پر برف جیسی سفیدی تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، چہرہ لاش کی طرح بے جان تھا اور آنکھوں کے ویران حلقوں میں موت سایہ فگن دکھائی دیتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر رکھے بالکل ساکت بیٹھا تھا اور اسکی آنکھیں ندیم پر مرتکز تھیں۔ کچھ نہ کہنے کے باوجود اسکی معذوری اور بے بسی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ ندیم کو اسکی حالت پر دکھ ہوا۔ اصل ندیم شہزاد کیا اتنا ہی بے حس اور خود غرض تھا کہ گھر کے اندر ایک بیمار فرد کو دیکھنے کے لئے ایک ہفتے میں ایک دن کے چند منٹ بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ اس نے سوچا پھر وہ آگے بڑھا اور جھک کر اس نے اپنا ہاتھ اس بوڑھے کے خشک لکڑی جیسے ہاتھ پر رکھ دیا جس کی جلد پر پھولی ہوئی رگوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان آنکھوں کی کیفیت یکلخت بدل گئی ہے۔ حیرت، مسرت اور اظہار ممنونیت نے شکایت آمیز ملامت کی جگہ لے لی ہے۔ اسے مفلوج جسم میں ہلکی سی لرزش کا احساس بھی ہوا جو ایک اضطرابی کیفیت کی غماز تھی۔ اس نے ہاتھ کو آہستہ سے تھپکا۔ کرسی کے ہتھے پر جمی ہوئی انگلیاں لمحہ بھر کے لئے متحرک ہو کر ساکت ہو گئیں۔ "ڈاکٹر خالد۔" اس نے پھوپھی رشیدہ کی آواز سنی۔ "مجھے تو کوئی افاقہ نظر نہیں آتا۔"

"اعظم صاحب کو افاقہ علاج سے نہیں کسی معجزے سے ہی ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر خالد نے کہا۔ "تاہم میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔" پھوپھی رشیدہ نے مایوسی سے سر ہلایا اور ندیم کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دروازے میں رک کر ندیم نے اعظم صاحب کی طرف دیکھا تو اس بیمار پژمردہ چہرے کی ہر شکن اسے مسرت سے کانپتی نظر آئی۔ سنگدلی اس شخص کی تھی جس نے چند لمحوں کی یہ مسرت بھی اس لب گور کو بڑے بخل سے دی تھی مگر شرمندگی ندیم کو ہوئی۔ اس نے طے کیا کہ وہ اعظم صاحب کی زندگی کے آخری لمحات کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور پرسکون بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ ایک بار پھر اسے شدت سے اپنی اور اس ندیم شہزاد کی فطرت اور شخصیت کے تضاد کا احساس ہوا۔

اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ کوریڈور میں بالکل سامنے کے کمرے کا دروازہ کھلا اور نو دس برس کا ایک لڑکا باہر نکلا۔ "ڈیڈی۔" وہ اسکی طرف دوڑا اور اس کے گلے میں جھول گیا۔ ندیم گرتے گرتے بچا۔

"خرم۔" پھوپی رشیدہ نے اسے ڈانٹا۔ "تم ابھی تک کھانے کے لئے نہیں گئے۔؟"

"جا تو رہا ہوں۔" وہ نہایت بدتمیزی سے بولا اور دوڑتا ہوا ایک کمرے کا دروازہ کھول کر غائب ہو گیا۔ ندیم نے صورت سے بیٹے کو بھی نہیں پہچانا تھا۔ اور اسے کسی جذباتی رشتے کی موجودگی کا بھی قطعی احساس نہ ہوا تھا مگر اس کا نام جان کر ندیم کی ایک اور الجھن کم ہو گئی تھی۔ کھانے کے کمرے کا دروازہ بھی اس نے پورے اعتماد سے کھولا۔ طویل میز کے گرد چار وردی پوش بیرے دست بستہ کھڑے تھے۔ میز پر وہ سب موجود تھے، اس کی بیوی شاہینہ، گوہر اور خرم۔ اس نے محسوس کیا کہ میز کے آخری کنارے پر گوہر کا بیٹھنا آداب کے خلاف ہے لیکن وہ کچھ کہے بغیر اپنی بیوی کے ساتھ جا بیٹھا۔ اس کے بالکل سامنے پھوپھی رشیدہ اور خرم تھے۔

"ڈیڈی۔" خرم نے اچانک کہا۔ "میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"کیا۔؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "اسکول نہیں جاؤ گے. کیوں۔؟"

"بس میری مرضی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "میرا دل نہیں چاہتا پڑھنے کو۔ اس کمینی استانی سے۔"

"اگر میں نے پھر کبھی یہ بات تمہاری زبان سے سنی تو کھال ادھیڑ دوں گا۔ سمجھے؟" ندیم نے سخت لہجے میں کہا۔ خرم نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گھورا مگر اس کا موڈ دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ ندیم کو اتنے کم عمر بچے کی اتنی سرکشی پر تعجب ہوا۔ کیا باپ نے اسے بالکل ڈھیل دے رکھی تھی۔ آخر یہ بدتمیزی اور زبان درازی وہ کیسے برداشت کرتا تھا۔ دفعتاً خرم نے اپنے سامنے رکھے ہوئے ڈونگے کو ہاتھ مار کے نیچے گرا دیا۔ "میں نہیں کھاتا یہ سالن۔"

ندیم کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "خرم۔" اس نے گرج کر کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔؟" خرم کھڑا ہو گیا۔ وہ خوفزدہ بالکل نہ تھا۔ اس نے کھانا چھوڑ کے بطور احتجاج باہر جانے کی کوشش کی۔ "ادھر پکڑ کے لاؤ اس کو۔" ندیم نے غصے سے بے قابو ہو کر ایک بیرے کو اشارہ کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسکے رویے نے سب کو پریشان کر دیا ہے۔

"ندیم۔" گوہر نے سخت لہجے میں کہا۔ "نوکروں کے سامنے۔"

"شٹ اپ۔" وہ اسکی طرف پلٹ کر دھاڑا۔ "میری اولاد کی تربیت میں مداخلت کرنے والے تم کون ہو۔؟" گوہر کا رنگ فق ہو گیا۔ شاید یہ بے عزتی اسکے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، شاید پہلے کبھی کسی نے اس سے یوں بات بھی نہ کی تھی۔ ندیم نے محسوس کیا کہ پھوپھی رشیدہ کی اور شاہینہ کی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی ہیں مگر اپنی بیوی کی صورت دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ ندیم کی طرفدار ہے. اسکی نظروں میں موافقت ہے۔ بیرے نے خرم کو اس کے سامنے

لاکھڑا گیا۔ ندیم کا طمانچہ اس کے رخسار پر پوری قوت سے پڑا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ "کیا سمجھ کے یہ حرکت کی تھی تم نے۔" وہ اسے پھر سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ وہ اسے کچھ اور سزا دینا چاہتا تھا۔

"اگر یہ ہوش میں نہیں تھا تو اسے سب کے ساتھ کھانے کی میز پر کیوں لاکے بٹھا دیا۔" گوہر نے کھڑے ہوکر اپنی بہن سے کہا۔

"کیا کہا۔؟ میں ہوش میں نہیں ہوں۔؟" وہ جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ بات تم مجھ سے کیوں نہیں پوچھتے۔؟"

"بیٹے ندیم۔" پھوپھی رشیدہ نے چلا کے کہا۔ "خدا کے لئے سکون سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" مگر گوہر نیپکن میز پر پٹخ کے باہر نکل گیا تھا۔ اسے بڑی خوشی ہوئی جب اسکی بیوی نے اپنے بھائی کی بے عزتی کا برا نہیں مانا اور سر جھکا کے کھانے میں مشغول ہو گئی۔ پھوپھی رشیدہ اور تمام بیرے دم بخود وہ کچھ دیکھتے رہے جو شاید انہوں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ "سامنے بیٹھو اور جو کھانا ہے تمیز سے کھاؤ۔" ندیم نے بیٹھتے ہوئے خرم کو حکم دیا۔ وہ سخت سہما ہوا سامنے جا بیٹھا۔ "میرا خیال ہے اس گھر میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" وہ کھاتے کھاتے بولا۔ پھوپھی رشیدہ چند لقمے کھا کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ خیال اگر تمہیں پہلے آیا ہوتا تو کچھ بھی نہ بگڑتا۔ مگر تمہیں تو شراب نے دنیا سے بیگانہ کر رکھا تھا۔" شاہینہ آہستہ سے بولی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤنگا۔" ندیم نے برا مانے بغیر کہا۔ "اور میں سب کچھ ٹھیک کر لونگا۔"

شاہینہ کا ہاتھ رک گیا۔ "ندیم۔ نہ جانے کیوں مجھے تمہارے رویے میں اس تبدیلی کا یقین نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے جیسے تم کوئی اور ہو۔ وہ نہیں جو تم تھے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "تم کچھ... کچھ وہ ہو گئے ہو جو میں چاہتی تھی۔ ہمیشہ سے۔"

❁

"یہ فیصلہ تم نے کب کیا؟ اور کیا تھا تو ہم سب کو اسی کی خبر کیوں نہیں دی۔"

"میں چاہتا تھا کہ یہ خبر آپ سب کو اچانک سناؤں۔" گوہر نے کہا۔ "لیکن ندیم کو معلوم تھا۔ آج سے نہیں چھ ہفتے سے یہ بات چل رہی تھی۔ اب میں نے سودا کر لیا ہے اور میرا خیال ہے اگر اس قیمت پر بات پکی ہو جائے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔"

ندیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کہے۔ اسکی بیوی اور پھوپھی کی سوالیہ نظریں اس پر ٹھہر گئی تھیں۔ مگر اس کے لئے تردید یا تائید میں کچھ کہنے سے خاموش رہنا بہتر تھا۔ چھ ہفتے تو کیا اسے چھ دن پہلے کی بھی کوئی بات یاد نہ تھی۔

"ندیم کی طرف کیا دیکھتی ہو۔" گوہر نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ ملازموں میں ہے مالکوں میں نہیں۔ پہلے بھی اس نے صرف میری مخالفت میں سارے دلائل دیئے ہیں کہ کاروبار کو یوں سنبھالا جا سکتا ہے اور یہ کیا جا سکتا ہے اور وہ کیا جا سکتا ہے۔"

"گوہر۔" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔ "میں اپنا حصہ فروخت کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔"

"کوئی بات نہیں بڑی بی۔ تم رکھو اپنا حصہ۔" گوہر نے اطمینان سے کہا۔ "میں اور شاہینہ....."

"نہیں گوہر۔" شاہینہ نے دفعتہً کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ شامل مت کرو۔ میں جمے جمائے کاروبار کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور تم کوئی فیصلہ اکیلے نہیں کر سکتے۔ میں اور پھوپھی رشیدہ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ہیں۔"

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔" گوہر نے تیز لہجے میں کہا۔

"گوہر۔" ندیم نے میز پر ہاتھ مارا۔ "شاہینہ اور پھوپھی رشیدہ کی عزت تم سے کم نہیں ہے۔ اور میں شاہینہ کے شوہر کی حیثیت سے بھی یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں اپنی زبان سے نکلے ہوئے کسی غلط لفظ پر پچھتانا پڑے۔"

گوہر نے اسے گھور کر دیکھا۔ "یہاں تم شاہینہ کے شوہر کی حیثیت سے نہیں اعظم سلک ملز کے جنرل مینجر کی حیثیت سے بیٹھے ہو۔ ہم سب کے ملازم کی حیثیت سے جو کاروبار کے مالک ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر میری رائے اتنی ہی غیر اہم ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میری غیر موجودگی میں تم ناجائز دباؤ ڈال کے شاہینہ سے یا پھوپھی رشیدہ سے کوئی غیر قانونی فیصلہ کرا لوگے۔"

"فیصلہ ہو چکا ہے۔" شاہینہ اسکے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ "میں کاروبار کو کسی صورت میں فروخت نہیں ہونے دونگی۔ مجھے معلوم ہے کہ اب تک ندیم کی عدم دلچسپی ڈیڈی کی بیماری اور تمہاری غلط منصوبہ بندی سے منافع کی شرح ضرور کم ہو گئی ہے لیکن کاروبار میں گھاٹا ابھی تک نہیں ہوا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہم اعظم سلک کو بیچ کر کوئی زیادہ منافع بخش کاروبار کر لیں تو اس میں کیا حرج ہے۔" گوہر نے برہمی سے کہا۔

"حرج ہو یا نہ ہو۔ میں اسکے حق میں نہیں۔" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔ "شاہینہ کا فیصلہ تم سن ہی چکے ہو۔"

صورت حال اب ندیم کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ ان سب کی مخالفت کے باوجود گوہر کاروبار کو ٹھکانے لگانے پر مصر تھا اور اسکی نیت یقیناً نیک نہیں تھی ورنہ اعظم سلک کے جنرل منیجر کی تجاویز کو یوں

جھکیوں میں نہ اڑاتا۔ اسے علم نہ تھا کہ ندیم شہزاد نے جو شاہینہ کا شوہر ہونے کے باوجود کاروبار میں حصے دار نہ تھا کاروبار کی تنظیم و تعمیر نو کے نئے کیا تجاویز پیش کی تھیں اور وہ کتنی کارآمد تھیں لیکن خود اس میں یہ ذمہ داری سنبھالنے کی اہلیت یقیناً تھی۔ اگر اصل ندیم کو اپنی عیاشی سے فرصت نہ تھی تو اسے گھر داماد بن کر بیوی کے کاروبار میں ملازم کی حیثیت کو قبول ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس کی جگہ وہ خود ہوتا تو اس رسوا کن طریقے پر یہ کام ہرگز نہ کرتا۔ جنرل منیجر کی حیثیت سے بھی کوئی اسکی تجاویز کو مسترد کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ تجاویز کا مطالعہ تو وہ یقیناً بعد میں بھی کرسکتا تھا لیکن سر دست اسے دو ڈائریکٹرز کی حمایت حاصل تھی چنانچہ وہ کچھ مطمئن ہوگیا۔

"تم یہ بات بھی بھول رہے ہو گوہر کہ کاروبار ڈیڈی کا ہے۔ سب سے زیادہ حصص ان کے ہیں اور وہ بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی فیصلہ ان کی تصدیق کے بغیر قانونی حیثیت حاصل نہیں کرسکتا۔" شاہینہ نے کہا۔

"چیئرمین۔؟" گوہر حقارت سے مسکرایا۔ "عملی طور پر وہ مر چکے ہیں شاہینہ باجی۔ اختیارات اب میرے پاس ہیں۔ وہ دستخط کرنا تو درکنار زبان سے بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں۔ اگر میں ان کے حصص بھی فروخت کرنا چاہوں تو کرسکتا ہوں۔"

"گوہر۔" پھوپھی رشیدہ نے چلا کر کہا۔ "بے غیرت۔ باپ کو جیتے جی مار رہا ہے۔ جاکے اس کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتا بدبخت۔ قتل کیوں نہیں کردیتا اسے۔" شاہینہ کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا تھا اور ندیم نے جب ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو اسے شاہینہ کے بدن میں لرزش کا احساس ہوا۔ یوں جیسے زلزلے سے پہلے زمین کانپتی ہے۔ بظاہر وہ ایک کمزور عورت تھی مگر شاید وہ اپنی ہر جذباتی کمزوری پر خود اعتمادی کا پردہ ڈالنے کی عادی تھی۔ اسکے لئے وہ اپنے آپ سے لڑتی تھی۔ اپنے آپ کو دھوکہ دیتی تھی مگر اسکے اعصاب شکست کی غمازی کرنے لگتے تھے۔ ندیم گوہر سے اسکی سرکشی اور سفاک اور سب کی بے بسی کا مذاق اڑانے والی اور اپنی فتح مندی کے غرور میں سرشار مسکراہٹ کے جواب میں کوئی سخت بات کہنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ ایک خادم نے چاندی کی طشتری میں کسی ملاقاتی کا کارڈ پیش کیا۔ گوہر نے کارڈ اٹھائے بغیر اس پر ایک نگاہ ڈالی اور ملازم سے کہا کہ وہ کمال صاحب کو بٹھائے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "ندیم۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بیرسٹر کمال تم سے بات کرنے آئے ہیں۔"

"مجھ سے؟" ندیم نے کہا۔ "کیا تم یہ نہیں بتاسکتے کہ یہ بات کیا ہوگی۔؟"

"بتاسکتا ہوں۔" اس نے ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مگر تمہارے مفاد میں یہی ہے کہ تم سب کے سامنے نہ پوچھو۔" اگر شاہینہ کا اشارہ نہ ہوتا تو وہ الجھ جاتا۔ لیکن پھر مصلحت کا تقاضا سمجھ کر وہ گوہر کے ساتھ چل پڑا۔

"ندیم صاحب۔" بیرسٹر کمال نے مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ "وہ لڑکی ڈبل نمونیہ میں مبتلا ہے اور اسے آکسیجن دی جارہی ہے۔ اگر وہ مرگئی تو اس موت کو بیماری سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ہم حادثے کی معقول وجہ پیش کرسکتے ہیں۔" ندیم نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پچاس پچپن برس کا متین اور باوقار شخص تھا۔

"کیسی معقول وجہ۔" گوہر نے کہا۔ "جب یہ حادثہ ہوا تو ندیم نشے میں تھا۔"

"یہ کون ثابت کرے گا۔" بیرسٹر کمال نے کہا۔ "حادثے میں تو بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ مثلاً بریک فیل ہوجانا۔"

"کیا پولیس اب تک یہ نہ دیکھ چکی ہوگی کہ حادثے میں کسی خرابی کا دخل نہ تھا۔" گوہر نے اسکی بات کاٹی۔

"میں صرف مثال دے رہا تھا۔" بیرسٹر کمال نے کہا۔ "کہنے کو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حادثے کے وقت گاڑی وہ لڑکی چلارہی تھی۔ ثابت یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ لڑکی ندیم صاحب سے گاڑی مانگ کر لے گئی تھی اور حادثے کے وقت ندیم صاحب جائے حادثہ کے قریب بھی نہ تھے۔ حادثے کا عینی گواہ کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن یہ جھوٹ ہوگا۔" گوہر نے کہا۔ "صریح جھوٹ۔"

"جھوٹ۔؟" بیرسٹر کمال نے کہا۔ "مسٹر گوہر۔ آپ چاہتے کیا ہیں آخر؟۔ اگر آپ کا مقصد اس واقعے کی تشہیر ہے تو میں اس معاملے سے الگ ہوجاتا ہوں۔ آپ شوق سے عدالت میں اپنے بہنوئی کے خلاف بیان دیجئے۔ اسے قاتل ثابت کیجئے۔ خاندان کی رسوائی کا اور جگ ہنسائی کا خیال کئے بغیر سچ بولتے رہ۔"

"ندیم کو اپنا بہنوئی اور اپنے خاندان کا فرد بنانے میں میری رائے کو دخل نہیں تھا۔" گوہر نے تلخی سے کہا۔

"میں نے اب بھی آپکی رائے طلب نہیں کی۔" بیرسٹر کمال نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "آپ اگر مجھے میرے موکل سے تنہائی میں گفتگو کرنے دیں تو بہتر ہے۔"

ان مہذب الفاظ کا دوسرا مطلب تھا "گیٹ آؤٹ" طیش کی شدت سے گوہر کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ اس نے ایک قہرآلود نگاہ ندیم پر ڈالی جو بالکل پرسکون بیٹھا تھا۔ پھر وہ دھڑ سے دروازہ بند کرکے نکل گیا۔

"ندیم صاحب۔ کیا یہ درست ہے کہ جب آپ آفس سے اس

لڑکی کے ہمراہ گئے تھے تو نشے میں تھے؟" کمال نے کہا۔

"کون سی لڑکی؟" ندیم نے کہا۔ "کمال صاحب مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"غالباً آپ کے ذہن پر صدمے کا اثر ہے۔ خیر میں آپ کو یاد دلاتا ہوں۔ آپ شاید اپنے آفس سے نکل کر اس لڑکی سے ملنے گئے تھے۔ ممکن ہے وہ آپ کو راستے میں ملی ہو۔ پھر اس کے ساتھ آپ شہر سے سمندر کی طرف گئے۔ شام کا وقت تھا اندھیرا اس وقت پوری طرح نہیں پھیلا تھا لیکن آسمان پر گہرے سیاہ بادل محیط تھے چنانچہ اجالا بھی نہ تھا پانچ بج کر تیس منٹ کے قریب آپ کی کار قابو سے باہر ہو گئی اور آپ چٹان پر سے نیچے سمندر میں جا گرے۔ جب یہ حادثہ پیش آیا تو۔۔۔۔"

"اس وقت پانچ بج کر سینتیس منٹ ہوئے تھے۔" ندیم نے بے ساختہ مداخلت کی۔

"بیرسٹر کمال کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔" خیر۔ وقت سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گاڑی کے بے قابو ہو جانے کا سبب کیا تھا۔ آپ کی رفتار حد سے زیادہ تھی یا آپ نشے میں تھے۔۔۔ یا۔۔۔ کسی جذباتی لمحے میں۔"

"مجھے۔۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔۔۔۔" ندیم نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ندیم۔ یہ عذر نہیں چلے گا۔ آپ نے مجھے ابھی ابھی حادثے کا صحیح وقت بتایا ہے۔ لیکن اس وقت آپ عدالت میں بیان نہیں دے رہے ہیں۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے حقائق کا علم ہونا چاہیے۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں مسٹر کمال۔" ندیم نے اپنی گھڑی اتار کے اس کے سامنے رکھ دی۔ کمال نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا جس میں سوئیاں پانچ بج کر سینتیس منٹ پر رک گئی تھیں۔ کمال نے سر ہلایا۔ "ندیم صاحب۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "فلموں اور ناولوں میں یادداشت کھو جانے کی بات اور ہوتی ہے۔ عدالت کے پاس ایسے ذرائع ہوتے ہیں کہ وہ جھوٹ سچ کا پتا چلا لے۔ آپ لاکھ اداکاری کریں۔ ذہنی امراض کے ماہرین سے حقیقت کو نہیں چھپایا جا سکتا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ یہ ڈرامہ تو ہر مجرم کر سکتا ہے کہ سزا سے بچنے کے لئے دیوانہ بن جائے۔"

"کمال صاحب۔" ندیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے تو آپ کو میری وکالت کرنے کی ضرورت نہیں میں اپنی دیوانگی کی سزا خود بھگت لوں گا۔"

"ندیم۔" کمال نے یکلخت رسمی گفتگو کے ادب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم نے ہمیشہ مجھ پر اور میری نیت پر شبہ کیا ہے۔ تم تنگ نظر اور حاسد ہو۔ تم نے اب تک گیارہ برس پرانی اس رنجش کو نہیں بھلایا ہے جس کا سبب شاہینہ تھی۔ قصور میرا اتنا تھا جس نے عمر کے تفاوت کے باوجود اس سے شادی کا پیغام بھجوا دیا تھا۔ مگر کیا چچا زاد بہن کے لئے رشتہ مانگنا وہ جرم ہے جسے تاحیات معاف نہ کیا جا سکے؟ کیا اعظم سلک میں قانونی مشیر کی حیثیت سے میرے تقرر کی بنیاد صرف یہ ہے کہ میرا غریب باپ اعظم صاحب کا بڑا بھائی تھا؟"

"یہ کیا بکواس ہے؟" ندیم کا چہرہ گرم ہو گیا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"ہاں مگر تم نے رویہ ہمیشہ ایسا ہی اختیار کیا ہے۔ میرے ساتھ ہی نہیں شاہینہ کے ساتھ بھی۔" کمال نے تیز آواز میں کہا۔ "کسی وجہ کے بغیر تم نے ہم دونوں کو احساس جرم میں مبتلا کر رکھا ہے اور اگر مجھ پر اعظم چچا کے اتنے احسانات نہ ہوتے تو میں لعنت بھیجتا قانونی مشیر بننے پر میں کوئی معمولی وکیل نہیں ہوں جو دس ہزار روپے ماہانہ قبول کرنے پر مجبور ہو۔ مگر میں صرف اعظم چچا کے اور ان کے خاندان کے ہر فرد کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں جو میرے امکان میں ہے تاکہ میں اس احسان کا بدلہ اتار سکوں جو انہوں نے مجھے تعلیم دلوا کر اور مجھے وکیل بنا کے اور اس پوزیشن کا مالک بنا کر کیا تھا۔ شاید میرا غریب باپ یہ نہ کر سکتا۔ یہ میرا اپنا خاندان ہے جس کی آبرو مجھے عزیز ہے۔ اور تم میرے محسن کی لڑکی کے شوہر ہو۔" کمال کا چہرہ فرط جذبات سے تمتمانے لگا تھا۔ "اپنے احمقانہ رویے کے باوجود۔"

ندیم کو حیرت اور صدمے نے مفلوج کر دیا تھا۔ "آئی ایم سوری کمال۔ اگر میرا رویہ پہلے واقعی ایسا تھا تو اب نہیں ہو گا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں لیکن میں تمہاری بات مان لیتا ہوں اور اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ ہمارے درمیان اب کوئی غلط فہمی نہیں۔" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "وہ ندیم مر چکا ہے جو غلط فہمی کا شکار تھا۔"

کمال نے حیرت سے اسے دیکھا پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اس نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا۔ "غالباً تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم واقعی اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو۔ خیر۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"کمال۔" ندیم نے کہا۔ "اگر۔۔۔ اگر وہ لڑکی مر گئی تو۔۔۔ تو کیا ہو گا۔؟"

"میں۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ کم سے کم چھ ماہ۔۔"

کمال نے تذبذب سے کہا۔

"اور۔۔۔اور وہ ہے کون؟ میرا مطلب ہے۔۔۔" ندیم نے پوچھا۔

کمال نے بریف کیس سے ایک اخبار نکالا۔" اسے پڑھ لینا تمہیں سب یاد آجائے گا۔"

ندیم نے اس کے پہلے صفحے پر ایک ـــــ خبر کے گرد سرخ حاشیہ دیکھا جو پنسل سے لگایا گیا تھا۔ خبر کے ساتھ ایک تصویر تھی۔ بیس بائیس برس کی ایک لڑکی کی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ مگر یہ چہرہ تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

"کمال۔" ندیم نے کہا۔" یہ لڑکی۔ ذکیہ۔ ٹائپسٹ ہونے کے باوجود طارق روڈ پر رہتی تھی اور مرسڈیز ڈرائیو کرتی تھی۔ کس آفس کا باس اس پر اتنا مہربان تھا؟"

"اعظم سلک ملز کا جنرل منیجر۔" کمال نے اس کی صورت کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔" جبکہ وہ مرسڈیز کار بھی۔"

"گویا وہ۔۔۔۔۔ کار ذکیہ کی نہیں تھی۔" ندیم نے کہا۔ گھبراہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔" وہ میری کار تھی وہ؟"

"ہاں۔ وہ کبھی کبھی اپنے بہنوئی کی فاکس ویگن لے آتی تھی اور اس روز یہ فاکس ویگن اعظم سلک ملز کے احاطے میں کھڑی ہوئی ملی۔ پولیس نے اس کار کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔" کمال نے سنجیدگی سے کہا۔ "ندیم۔۔۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ صورت حال کس حد تک سنگین ہے اور واقعات کی شہادت کہاں تک تمہارے خلاف ہے؟"

❁

گیراج اس کوٹھی کے عقب میں تھا۔ ایک قطار میں چھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خالی پڑا تھا دو کے دروازے بند تھے اور تین میں کاریں کھڑی تھیں۔ صرف ایک کار کا شوفر موجود تھا۔ "چابی ہے تمہارے پاس۔؟" ندیم نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ شوفر بڑی مستعدی سے آگے بڑھا۔" یس سر۔" اس نے سگریٹ پھینک کر اسی سفید مرسڈیز کا دروازہ کھولا جو اسے قصر اعظم تک لائی تھی۔

گاڑی ندیم کے ایک اشارے پر ہوا ہوگئی اور وہ قصر اعظم سے گزر کر ناظم آباد کی سڑک پر آیا تو اپنی ڈرائیونگ کی صلاحیت کو اطمینان بخش پا کر اسکے اعتماد کو بڑی تقویت پہنچی۔ خبر میں طارق روڈ کے سوا کچھ نہ تھا اور اس بارونق سڑک کی دونوں جانب پھیلے ہوئے بازار میں کسی سے ذکیہ نام کی کسی لڑکی کا پتا پوچھنا عبث تھا۔ وہ محض اس امید پر آیا تھا کہ شاید کسی آشنا مقام سے کوئی یاد وابستہ ہو جو اسکے حافظے کو متحرک کردے۔ کسی جگہ کو دیکھ کر اسے کوئی بات یاد آئے۔ کوئی ایسی بات جو اسے اپنے گم گشتہ ماضی کے واقعات کی ٹوٹی ہوئی کڑی سے جوڑ دے۔ کوئی راستہ جو اسے لاشعور کی بھول بھلیوں سے نکال کر صراط مستقیم پر ڈال دے۔ کوئی صورت آشنا ملے جو اسے بتا دے کہ وہ کون تھا اور ذکیہ نام کی کسی لڑکی سے جو طارق روڈ پر رہتی تھی اس کے مراسم کی نوعیت کیا تھی۔ لیکن یہ موہوم سی امید بھی اب مٹ رہی تھی۔ وہ طارق روڈ کی عقبی گلیوں سے گزر کر لوٹ رہا تھا کہ یکلخت اس نے ایک مقام کو پہچان لیا اور غیر ارادی طور پر اسکے ایک پیر نے بریک لگا کر گاڑی کو روک لیا۔

"اس چھوٹے سے اسنیک بار کو میں پہچانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اسکے بند دروازوں کے پیچھے فرش پر بچھے ہوئے قالین کا ڈیزائن کیا ہے اور فرنیچر کس ترتیب سے لگایا گیا ہے اور وال لائٹس کیسی ہیں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا پھر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کی صورت اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس کے سامنے آگئی اور وہ گاڑی بند کرکے اتر آیا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ وہ شخص رشتے میں اس کا بہنوئی ہے۔

"ندیم۔" اس کے بہنوئی نے اسے حیرت اور مسرت سے دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو۔؟ اتنے دن کہاں رہے۔ مریم تمہیں ہر روز پوچھتی تھی۔"

ندیم بہت خوش تھا۔ اس نے بالآخر کسی کی مدد کے بغیر اپنا ایک رشتہ تلاش کرلیا تھا۔ وہ کاؤنٹر کے سامنے لگے ہوئے اونچے اونچے اسٹولوں میں سے ایک پر ٹک گیا۔ "عظیم۔ میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔" اس نے ہال میں بیٹھے ہوئے چند افراد کو دیکھا جو اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔

"مجھے معلوم ہے۔" عظیم نے کہا۔" تم ذکیہ سے ملے؟ کیا حال ہے اس کا؟"

"عظیم۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ مجھے اس لڑکی سے اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔"

"کیا۔؟" عظیم نے حیرانی سے کہا۔" یعنی تمہیں یاد نہیں کہ اس روز تم یہیں سے اس کے ساتھ گئے تھے۔؟"

ندیم نے مایوسی سے سر ہلایا۔" تم یقین کرو یا نہ کرو مگر حقیقت یہ ہے کہ میری یادداشت کو کچھ ہوگیا ہے۔"

عظیم اسے پریشانی سے دیکھتا رہا۔" ندیم۔ وہ میرے پڑوس میں رہتی ہے۔ میں نے ہی اسے تمہاری مل میں رکھوایا تھا کیونکہ وہ مریم کی بڑی گہری سہیلی تھی۔ اسی کے کہنے پر میں نے سفارش کی تھی تم سے۔ وہ مہینہ بھر سے دن رات تمہاری باتیں یوں کرتی تھی جیسے تم سے بڑا اس کا چاہنے والا کوئی نہیں اور مریم کو بڑی تشویش یہ تھی کہ اگر اسکی باتوں کی بھنک بھی شاہینہ کے کانوں میں پڑ گئی تو تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ میری اور مریم کی سمجھ میں تمہاری اس حماقت آمیز محبت کا کوئی جواز نہیں آتا تھا کیونکہ وہ لڑکی بھی شادی شدہ تھی اور کچھ یوں لگتا تھا جیسے

وہ عمداً اپنے اور تمہارے تعلق کی داستان کو پھیلا رہی ہے۔ اس کا شوہر بہت ظالم ہے۔ آئے دن وہ بیوی کی ٹھکائی کرتا ہے اور ہم اپنے فلیٹ میں ساری چیخ پکار سنتے ہیں۔ وہ اسے کھلم کھلا آوارہ اور بدکردار کہتا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ نوبت طلاق تک آنے والی تھی۔ مگر تم نے بھی تو کمال کر دیا ہے یار۔ ہسپتال جا کے اسے دیکھتے تو سہی۔ میں نے سنا ہے اس نے بے ہوشی میں کچھ اول فول بکا ہے اور پولیس اس کا حسب منشا مطلب نکال رہی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" ندیم نے کہا۔ عظیم کی باتوں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ "اس نے میرے خلاف کچھ کہا ہے؟"

"وہ بات ان حالات میں یقیناً تمہارے خلاف جا سکتی ہے۔ سنا ہے اس نے کہا کہ تم اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔" عظیم نے کہا۔

"ان حالات میں کیا میرا ہسپتال جانا مناسب ہو گا۔" ندیم نے سوچتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹر پر ایک جوڑا آ بیٹھا تو وہ کچن سے گزر کر عقبی دروازے سے اندر جا پہنچا۔ مریم کے کمرے تک جانے اور اسے پہچاننے میں ندیم کو قطعی دشواری نہ ہوئی۔ یہ ایک ایسا گھر تھا جس کے درودیوار سے شناسائی تھی۔ جہاں وہ پورے اعتماد سے سب کچھ شناخت کر سکتا تھا۔ "ندیم۔" مریم اسے دیکھتے ہی چلائی اور ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھ کر اسکی طرف دوڑی۔ "یہ۔۔۔۔ یہ کیا چکر ہے۔۔۔۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔۔۔۔ پھر میں نے دو بار فون کیا لیکن تم گھر پر نہیں ملے۔ کہاں تھے تم۔ ڈر کے مارے میں کسی اور سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی اس چڑیل نے آخر تمہیں چکر میں ڈال دیا۔" وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ پھر پورے سکون سے اس نے ساری بات مریم کو بتائی۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ ساری دنیا میں اسکی بہن ہی ہے جو اسکی بات کو سمجھ سکتی ہے۔ اس پر یقین کر سکتی ہے۔

"وہ تمہاری کار لے گئی تھی یا۔۔۔۔ یا تم بھی تھے اس کے ساتھ؟ ندیم یہ سب شراب کا قصور ہے۔" مریم بولی۔

"میں نے کہا نا مجھے کچھ یاد نہیں۔ اور میں اب شراب چھوڑ چکا ہوں۔" ندیم نے کہا۔ "تمہاری قسم۔"

"وہ۔۔۔۔ وہ تمہارے بارے میں جتنی باتیں مجھے بتاتی تھی۔۔ کیا وہ درست تھیں ندیم؟" مریم نے روتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اس قدر گرا ہوا انسان ہو سکتا ہوں۔"

"بات دنیا کے یقین کی ہے ندیم۔ گوہر نے کچھ کم ڈھنڈورا پیٹا ہے تمہاری مے نوشی کا۔ اور تمہاری غیر ذمہ دارانہ فطرت کا۔" مریم بولی۔ "وہ بھلا یہ موقع ہاتھ سے جانے دے گا۔ وہ تو تمہارا دشمن ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔" اس نے مریم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "امی اور ابا کا کیا حال ہے؟"

مریم نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اسکی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ "ندیم۔۔۔ تم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوتے ہو۔۔ تم گھر تک پہنچ جاؤ گے نا؟ یا میں چلوں تمہارے ساتھ۔ راستہ یاد ہے تمہیں؟"

"ہاں۔۔۔" وہ بولا۔ "لیکن تشویش کی کیا بات ہے اس میں۔ آخر میں یہاں پہنچا بھی تو ہوں۔"

"کیا تمہیں یاد نہیں کہ ابا کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور امی کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے۔" وہ بولی۔

"اچھا؟" ندیم نے ایک ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا۔ "خیر۔۔ مجھے یقین ہے مریم کہ بالآخر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹی وی پر رکھی ہوئی تصویر نے اسکے قدم پھر روک لئے۔ یہ اسکے ماں باپ کی تصویر تھی۔ اسے بمشکل کچھ یاد آگیا۔ "مریم۔" وہ پلٹ کر بولا۔ "کیا۔۔ کیا امی مجھ سے ناخوش تھیں۔"

"ہاں۔۔" مریم نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ "لیکن قصور تمہارا نہیں تھا ندیم۔ تم نے ان کے لئے سب کچھ کیا تھا۔ تم نے ان کی بہت خدمت کی تھی۔" ندیم تصویر کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنا باپ بالکل اپنی طرح لگا۔

"ندیم۔" اس نے مریم کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "اس بینک والے کیس کے سلسلے میں تم کیا کر رہے ہو؟"

"بینک والا کیس؟" اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"شاید تمہیں یاد نہیں۔ عظیم نے تمہاری چیک بک پر تمہارے دستخطوں سے کچھ رقم نکلوائی تھی۔۔" وہ رک رک کر بولی۔ اسکی نگاہ فرش پر تھی اور وہ انگوٹھے سے قالین کو کرید رہی تھی۔ "کیا تم۔۔ تم انہیں جیل بھجوا دو گے؟ میں وعدہ کرتی ہوں ندیم میں وہ سب رقم ادا کر دوں گی۔۔ اگر اسے سزا ہو گئی تو۔۔۔" وہ اچانک رو پڑی۔

"میں۔۔۔۔ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا مریم۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔۔۔ میں کوئی وعدہ کیسے کر لوں۔۔۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "بات اگر میرے اختیار میں ہو گی تو میں اپنا سب کچھ دے کر بھی عظیم کو بچا لوں گا۔" پھر وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہوئے اسکی نظر ایک لنگڑے شخص پر پڑی جو اسکی گاڑی کے قریب کھڑا عجب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسکا دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ ذکیہ۔ مریم۔ شاہینہ۔۔۔ تین عورتیں اس کے اعصاب پر سوار تھیں وہ خود اغوا اور قتل کے جرم میں ملوث تھا۔ اسکا بہنوئی غبن کا ملزم تھا۔ اسکا سالا کاروبار فروخت کرنے کے چکر میں تھا۔ اسکا

خسر بستر مرگ پر تھا۔ اور اسے کچھ یاد نہ تھا کہ اتنے بہت سے مسائل کے جنگل میں وہ راستہ کدھر ہے جو سلامتی کا اور اندیشوں سے محفوظ کا راستہ ہے۔

"ندیم صاحب!" ایک کار سے اترنے والے شخص نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اسے قطعی نہ پہچانا۔

"کیا یہ خبر صحیح ہے کہ اعظم سلک ملز کو فروخت کیا جارہا ہے۔ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ جو اسے بند کرکے اس جگہ سینما بنانا چاہتا ہے؟" اس شخص نے کہا۔

"کس احمق نے کہا ہے یہ تم سے!" ندیم اس پر برس پڑا۔ "کس کی ہمت ہے اعظم صاحب کی زندگی میں کاروبار کو فروخت کرنے کی یا بند کرنے کی۔"

وہ خاصا معزز آدمی تھا لیکن اس نے ندیم کے توہین آمیز رویے پر ضبط سے کام لیا۔ "ندیم صاحب۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ پلانٹ منیجر کی حیثیت سے میرا یہ فرض تھا کہ آپ سے بات کروں میں آپکے ساتھ ہوں اور میرے خیال میں آپ کی پیش کردہ تجاویز سے گوہر صاحب کا اختلاف ذاتی دشمنی کی بنا پر ہے ورنہ ان تجاویز سے کاروبار کو یقیناً زبردست فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ آپ نے اپنی رپورٹ پر واقعی بہت محنت کی تھی۔"

ندیم کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "معاف کرنا۔ میں نے اپنی پریشانی میں تم سے یوں بات کی۔" کوشش کے باوجود اسے پلانٹ منیجر کا نام یاد نہ آیا۔ "تم نے وہ تجاویز ــ دیکھیں ہیں؟"

"یس سر۔" وہ بولا۔ "اور میں چاہتا ہوں کہ آپ ان تجاویز کو بورڈ کے سامنے رکھیں۔ کاروبار کو فروخت ہرگز نہ ہونے دیں۔ نفع نقصان کے علاوہ یہ سینکڑوں افراد کے بے روزگار ہوجانے کا مسئلہ ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" ندیم نے کہا۔ "تم اطمینان رکھو یہ کاروبار ہرگز بند نہیں ہوگا۔ بورڈ کے اجلاس میں میری طرف سے ان تجاویز کی افادیت پر تم بحث کروگے۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"تھینک یو سر۔" پلانٹ منیجر نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں آپ میں زبردست تنظیمی صلاحیت ہے۔ صرف آپ نے اس کا استعمال نہیں کیا۔" اسکے لہجے میں تاسف تھا۔ مگر اسکی بات سمجھ لینے کے باوجود ندیم نے اسے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ وہ شراب بالکل نہیں پیتا ہے اور برا نا ندیم شہزادہ نہیں ہے 'قصر اعظم' تک اسکا ذہن متضاد اور متنوع خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ لیکن وہ راستہ نہیں بھولا۔ گاڑی کے کمپاؤنڈ میں

کسی سفارتخانے کی ایک دعوت میں ایک ممتاز شہری نے ایک جرنیل سے جو بے شمار تمغے اپنی وردی پر سجائے ہوئے تھا یونہی گپ شپ کی خاطر پوچھا: "جنرل۔ اتنے بہت سے تمغے آپ کو کس طرح مل گئے؟"

"ایک کباڑیا بیچ گیا تھا۔ چالیس روپے درجن کے حساب سے۔" جنرل نے جواب دیا۔

داخل ہونے سے قبل اسکی نگاہ اچانک ایک شخص پر گئی جو کھمبے کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ جب اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی تب بھی اسے کھلے گیٹ سے کھمبے کی روشنی کے نیچے اس شخص کا سایہ دکھائی دیا۔ وہ بجری بچھے راستے پر چلتا ہوا واپس گیٹ تک پہنچا۔ وہ اس شخص کی صورت دیکھنے کے علاوہ اس سے وہاں کھڑے ہونے کا مقصد پوچھنا چاہتا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود نہ تھا۔ ندیم نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا لیکن وہ شاید نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔ لیمپ پوسٹ کی ٹیوب لائٹ کے نیچے کھڑا ہوا شخص اچانک آگے بڑھا ندیم نے اسے پہچان لیا۔ طارق روڈ پر عظیم کے اسنیک بار سے نکلتے ہوئے اس نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ "تمہارے ساتھ یہی ہوگا مسٹر ندیم۔" وہ بولا پھر ندیم کے کچھ کہنے سے قبل وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا اور ذرا آگے کھڑی نیلے رنگ کی ایک پرانی کار میں بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ میں کار کی عقبی روشنی بھی غائب ہوگئی۔ خوف اور حیرت نے ندیم کو منجمد کردیا تھا۔ اس آدمی کے لہجے میں انتقام کی بازگشت تھی۔ زہر تھا۔ نفرت کی دہکتی ہوئی آگ تھی۔ اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسکے سامنے گوہر کھڑا تھا اور وہ دونوں اعظم ہاؤس کے پورچ سے خاصے دور تھے۔

"ندیم!" گوہر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں آخری بار وارننگ دے رہا ہوں۔ میری مخالفت چھوڑ دو۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔"

"خطرناک آدمی بزدلوں کی طرح چھپ کر بات نہیں کرتے۔" ندیم نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تمہیں تباہ کردوں گا ندیم۔ تم شاہینہ پر بھروسہ کرتے ہو نا۔ جس روز شاہینہ کو معلوم ہوا کہ تم دو مہینے سے اس ٹائپسٹ کے ساتھ عاشقی لڑا رہے تھے جو تمہارے بہن بہنوئی کے پڑوس میں رہتی ہے وہ سمجھ جائے گی کہ تم نے اسے کس گناہ کی پردہ پوشی کے لیے ہلاک کیا ہے۔ وہ دن اس گھر میں تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں اپنی بہن کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔"

"اور میں تمہیں بہن سے زیادہ سمجھتا ہوں گوہر۔" ندیم نے کہا۔ "تم نے میری بیوی کو مجھ سے بدگمان کرنے کے لئے سازش کی ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ تم مجھے اس گھر سے نکال کے بھی اس کاروبار کو فروخت نہ کرسکو گے۔ میری بیوی مجھے قاتل مان کر مجھ سے الگ ہوسکتی ہے مگر تمہاری ماں کر اپنے کاروبار سے الگ نہیں ہوسکتی۔"

"تم نے میرے باپ کو مجھ سے بدگمان کیا۔ میری بہن کا اعتماد مجھ سے چھینا۔ پھوپھی رشیدہ کی نظروں میں مجھے ذلیل کیا۔ اگر میں تباہ ہوا ندیم تو میں تم سب کو تباہ کر دوں گا۔" پرسکون ہونے کے باوجود اس کا لہجہ انتہائی خطرناک تھا۔ "میں اس لڑکی ذکیہ کو مروا دوں گا اور پھر دیکھوں گا تمہیں قتل کے الزام سے کون بچاتا ہے۔" وہ اچانک پلٹا اور انہی درختوں کے سائے میں غائب ہوگیا جدھر سے وہ نکلا تھا۔ ندیم نے محسوس کیا کہ اس کا ذہن گوہر کے شیطانی عزائم کو ناکام بنانے کے لئے پوری طرح مستعد ہے۔ وہ چیلنج قبول کر چکا ہے۔

خرم کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس نے اندر جھانکا۔ وہ شطرنج کی بساط بچھائے مہروں کو ایک دوسرے کے اوپر مینار کی شکل میں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔ "یوں کھیلتے ہیں شطرنج۔"

"آپ نے کھیلنا سکھایا ہی کہاں ہے۔ چھ مہینے سے ٹال رہے ہیں۔" وہ منہ پھلا کے بولا۔ "ہر روز کہہ دیتے ہیں کل سکھاؤں گا۔"

"اچھا۔؟" اس نے سر کھجا کے خفت کا اظہار کیا۔ "چلو پھر آج بازی ہو ہی جائے۔"

ایک گھنٹے تک وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شطرنج میں مصروف رہا۔ اس دوران شاہینہ ایک بار اندر آئی اور انہیں کھیل میں مگن دیکھ کر ٹھٹکی۔ ندیم کو اس کی صورت پر حیرت اور مسرت نظر آئی۔ رات کو جب خرم کے سو جانے کے بعد وہ اپنی خوابگاہ میں پہنچا تو اس کی بیوی تکیے پر کوئی کتاب رکھے لیٹی تھی۔ اس کے گھنے بال اس کی کمر پر پھیلے ہوئے تھے اور آسمانی رنگ کے شب خوابی کے باریک لباس میں اس کے بدن کے تمام نشیب و فراز کے حسن کی پردہ داری سے زیادہ پردہ دری کر دی تھی۔

"ندیم۔" رات کے کسی تاریک لمحے میں اس کی بیوی نے سرگوشی میں کہا۔ "تم بہت بدل گئے ہو۔ نہ جانے کیوں تم اچانک وہ پرانے ندیم بن گئے ہو جس سے میں نے محبت کی تھی۔ تم کہتے ہو تم نے شراب بھی چھوڑ دی ہے۔ تمہارا اعتماد اور تمہاری قوت فیصلہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے میری ہر دعا قبول کرلی ہے۔ تمہیں پھر میرے قریب کر دیا ہے۔ خرم کے قریب کر دیا ہے۔ آج جب میں نے تمہیں اس گھر کے معاملات میں اپنا فیصلہ منواتے اور اپنی حیثیت تسلیم کراتے دیکھا تو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ تمہاری اب تک کی ساری خطاؤں کو بھلا دیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ لڑکی کون تھی۔ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ اگر تم لوٹ آئے ہو تو تم میرے ہو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں ندیم۔ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"حقیقت کا تو مجھے بھی علم نہیں جان من۔" اس نے بے خیالی میں کہا۔ "لیکن تمہارے بغیر تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

وہم نے کسی سانپ کی طرح اس کے وجود میں سر اٹھایا۔ کیا یہ تمہاری جنت ہے؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گھر تمہارا ہے؟ اور کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟ اور تم اس بچے کے باپ ہو اور کیا تم واقعی ندیم شہزاد ہو۔؟ اسے اندھیرے میں ہر طرف سانپ نظر آنے لگے۔ "نہیں۔ مجھے یقین تو نہیں کہ میں ندیم شہزاد ہوں مگر مجھے یقین ہے میرا گناہ کوئی نہیں۔" اس نے گھبرا کر اپنی بیوی کی آغوش میں پناہ لی۔ ایک احساس جرم ٹوٹے ہوئے کانٹے کی طرح اس کے دل کے بہت اندر کھٹکتا رہا۔ اگر وہ اصل ندیم شہزاد نہ ہوا تو؟ اگر یہ عورت اس کی بیوی نہ ہوئی تو۔؟ تو وہ کیا کرے گا۔؟ کہاں جائے گا؟

❋

اس رات کا ہر مضطرب لمحہ سوتے جاگتے گزرا۔ جاگتے میں اس کے اپنے وہم کے عفریت اسے ڈراتے تھے سوتے میں وہ اس کے خوابوں کو تاراج کرنے لگتے تھے۔ صبح کاذب کا دھندلکا پھیلنے لگا تو وہ دبے پاؤں اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہینہ گہری نیند میں تھی۔ وہ دروازے کو آہستہ سے کھول کر کاریڈور میں آگیا۔ گھر کے راستوں سے وہ اب واقف ہو چکا تھا۔ اس نے کاریڈور کے آخر میں مڑ کر بائیں جانب والے دوسرے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ یہ لائبریری تھی جہاں اس نے دوپہر کے بعد بیرسٹر کمال سے ملاقات کی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لکھنے کی میز لگی ہوئی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر درازوں کو کھولنا شروع کیا۔ دائیں ہاتھ کی درمیانی دراز سے اسے نیلے رنگ کی ایک فائل ملی جس پر لکھا تھا "تنظیم نو کی تجاویز۔" اس نے یہ فائل اوپر رکھ دی۔ دوسری سرخ رنگ کی فائل پر "نقصانات کے اسباب کا تجزیہ" لکھا تھا۔ اس فائل کو بھی اس نے نیلی فائل کے ساتھ رکھ دیا۔ دائیں ہاتھ کی باقی درازوں میں اسے متفرق کاغذات ملے۔ بائیں ہاتھ کی سب سے نچلی دراز میں اسے پھر ایک ساتھ کارآمد دستاویز ملی۔ یہ اعظم سلک ملز لمیٹڈ کے آرٹیکل آف میمورنڈم کی ایک کاپی تھی۔ اسکے اندر ایک سادے کاغذ پر کسی نے اپنے ہاتھ سے حصہ داروں کی ملکیت کا تناسب تحریر کیا تھا۔ اعظم صاحب پچیس فیصد حصص کے مالک تھے۔ پھوپھی رشیدہ کے دس فیصد اور شاہینہ کے حصص پندرہ فیصد تھے۔ گوہر کا حصہ بیس فیصد تھا۔ پبلک کے لئے پندرہ فیصد رکھے گئے تھے۔ صرف ایک

نام ایسا تھا جس نے ندیم کو چکرا دیا۔ مسز اعظم کاروبار میں پندرہ فیصد کی شریک تھیں۔ اس نے اب تک نہ ان کا نام سنا تھا نہ صورت دیکھی تھی۔

آرٹیکل آف میمورنڈم سے اسے معلوم ہوا کہ کمپنی کا سرمایہ اور سند کسی اور کاروبار میں شامل کرنے کے لئے اکیاون فیصد حصص کے مالکوں کا متفق ہونا ضروری ہے لیکن کاروبار کو فروخت کرنے کے لئے شرط پچھتر فیصد کی تھی اس نے حساب لگایا کہ گوہر اپنے اور مخدوم بابر کے حصص ملا کر بھی صرف پینتالیس فیصد کا مالک بنتا ہے اگر وہ شاہینہ یا پھوپھی رشیدہ میں سے کسی ایک کو رضامند کر لے تو وہ کاروبار کو کسی دوسرے کاروبار میں مدغم ضرور کر سکتا ہے لیکن فروخت کا حق تو اسے ان دونوں کے حصص مل جانے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ قانونی صورت حال معلوم ہو جانے سے اسے گوہر کے مقابلے میں اپنی پوزیشن کے مستحکم ہونے کا احساس ہوا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ بہت دیر سے یہاں تھا لیکن وقت گزرنے کا اسے ہرگز احساس نہیں ہوا تھا۔ گھر کے نمبر تو تین ہی تھے مگر ہر نمبر کی ایکسٹنشن کے دو فون ہونے سے گھر کے نوکروں میں سے کہیں سے بھی بات کی جا سکتی تھی۔ "اعظم ہاؤس" ندیم نے کہا۔

"ندیم۔ میں کمال ہوں۔ اچھا ہوا جو براہ راست تم سے بات ہو گئی۔" بیرسٹر کمال نے کہا "صورت حال کچھ سنگین ہو گئی ہے۔ وہ لڑکی ذکیہ رات مر گئی۔ انہوں نے موت کا سبب نمونیہ ہی لکھا ہے لیکن پولیس شاید مطمئن نہ ہو۔ وہ تم سے سوال جواب ضرور کریں گے۔ میرے خیال میں اپنے دفاع کے لئے تمہیں صفائی کے کسی بیان کی ضرورت نہیں۔ تمہاری یادداشت کا کھو جانا تمہارے حق میں جاتا ہے۔ تم صرف یہی کہنا کہ مجھے کچھ یاد نہیں۔ باقی سب میں کر لوں گا۔ ندیم۔ ہلو... ہلو۔ ہلو ندیم۔ تم سن رہے ہو نا..... اس لئے میں نے تمہیں اتنی صبح فون کیا۔"

لیکن ندیم اپنے کانوں سے ریسیور لگائے بے یقینی اور بے خبری کے اس دشت میں بھٹک رہا تھا جہاں سب کچھ سراب کی طرح لگتا تھا۔ صرف ایک آواز تھی جو اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ ذکیہ مر گئی۔ ذکیہ مر گئی۔ وہ ذکیہ مر گئی جسے تم نے قتل کیا۔ جسے تم جانتے بھی نہیں تھے۔ جسے تم پہچاننے سے بھی انکار کرتے ہو۔ آخر تم نے اسے کیوں مارا؟ کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟ اس کے لئے فرار کے سب راستے مسدود تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کی آواز نے قانون کے آگے آنے والے ہاتھوں کو روکنا چاہا۔ مگر اسے احساس ہوا کہ وہ قطعی بے بس اور تنہا ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکا۔ گوہر نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے سگریٹ پیتا ہوا اندر آیا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "ندیم۔" وہ دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے بولا: "مجھ سے سودا کر لو۔"

ندیم کھڑا ہو گیا۔ "تنہا میں کوئی سودا کرنے کا مجاز نہیں۔ میں فقط ملازم ہوں۔ مالک نہیں۔"

"تم دوسروں کو قائل کر سکتے ہو۔ اور اگر تم قائل نہیں کرو گے تو میرے لئے سب کو قائل کرنا دشوار نہ ہوگا کہ ذکیہ کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔" گوہر نے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ذکیہ مر گئی ہے؟"

"جس فون پر تم بات کر رہے تھے اس کی گھنٹی میرے کمرے میں بھی بجتی ہے۔" گوہر مسکرایا۔ "میں نے وہ سب گفتگو سنی ہے جو تم نے اتنی صبح بیرسٹر کمال سے کی ہے۔"

"اور تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو۔" ندیم نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تم سمجھتے ہو یادداشت کھو جانے کا عذر پیش کر کے تم بچ جاؤ گے۔" گوہر نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"اپنے قول و فعل کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ لیکن گوہر یہ ہتھکنڈے استعمال کر کے تم میرے جیتے جی اس کاروبار کو چوپٹ نہیں کر سکتے۔" ندیم نے کہا۔

"میں تمہیں قتل بھی کر سکتا ہوں۔" گوہر نے اچانک چیخ کر کہا۔ سگریٹ کو پیروں سے مسل کر اس نے ندیم کو ایک غلیظ گالی دی۔ ندیم کا دماغ الٹ گیا۔ اس نے پوری قوت سے گوہر کے جبڑوں پر ایک مکا رسید کیا۔ گوہر کرسی سمیت الٹ گیا اور اس کا سر میز سے ٹکرایا۔ چوٹ کی پروا کئے بغیر اس نے کرسی اٹھا کے ندیم کو مارنے کی کوشش کی مگر اسی وقت دروازہ دھڑ سے کھلا اور پھوپھی رشیدہ کا وحشت زدہ چہرہ نظر آیا۔ کرسی میز سے ٹکرائی۔ "ندیم۔ گوہر۔ تم لڑ رہے ہو کتوں کی طرح۔ شرم کرو۔ اس گھر کے نوکروں کو آج تک کسی نے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اعظم کو مارنا چاہتے ہو نو یوں کیوں مارتے ہو کم بختو ۔۔۔"

"پھوپھی رشیدہ۔" ندیم نے کہا۔ "گوہر کل سے دوبار مجھے دھمکی دے چکا ہے کہ میں نے کاروبار کو فروخت کرنے کے ارادے کی مخالفت کی تو مجھے قتل کر دے گا۔ مگر ابھی اس نے مجھے جو گالی دی تھی وہ ناقابل برداشت تھی۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا تو کھلے دروازے میں اسے شاہینہ کا چہرہ نظر آیا۔

"گوہر۔" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔ "تو نے اعظم کا وصیت نامہ دیکھا ہے بول۔"

"مجھے کسی وصیت نامے سے غرض نہیں۔ جو میرا دل چاہے گا میں کروں گا۔" گوہر پھنکار کر بولا۔

"میں جانتی ہوں تم ندیم کے دشمن کیوں ہو رہے ہو گوہر۔" شاہینہ نے کہا۔ "اور ندیم سے زیادہ اس کاروبار کو تباہ کرنے کی فکر کیوں ہے تمہیں؟ تمہیں صدمہ ہے کہ ڈیڈی نے اپنی جگہ تمہیں چیئرمین نامزد کیوں نہیں کیا۔"

"ایک آدمی کا فیصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ خصوصاً اس آدمی کا جو ذہنی طور پر معذور ہو۔" گوہر نے کہا۔

"یہ فیصلہ بہت پرانا ہے۔ ڈیڈی پر فالج کا حملہ ہونے سے قبل ہی میں نے اور پھوپھی رشیدہ نے اس پر دستخط بھی کر دیئے تھے۔" شاہینہ بولی۔ "یہ بورڈ کا فیصلہ ہے گوہر۔ تم اکیلے اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔"

"ڈیڈی کو کیا حق تھا ایک غیر آدمی کو کاروبار کا مالک بنانے کا۔" گوہر نے زخمی سانپ کی طرح بل کھا کے کہا۔

"اور جسے تم یہ کاروبار فروخت کرنا چاہتے ہو کیا وہ غیر نہیں ہے؟" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔" ندیم نے کہا۔ "تم اپنے اور ڈیڈی کے حصص ملا کے صرف پینتالیس فیصد کے مالک بنتے ہو۔ شاہینہ کے ملا لو تو ساٹھ فیصد اور پھوپھی کے بھی ہوں تو ستر فیصد ہو جاتے ہیں۔ کاروبار کو فروخت کرنے کے لئے تو تمہیں کچھ فیصد حصص کے مالکوں کی حمایت چاہیئے۔ تمہارے پاس تو مدغم کرنے کے لئے اکیاون فیصد بھی نہیں۔"

"اچھا ہوا جو تمہاری یادداشت کا یہ عملی مظاہرہ تمہاری اپنی بیوی نے بھی دیکھ لیا۔" گوہر نے باہر جاتے جاتے کہا۔ وہ گوہر کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا مگر اس نے زبان پر آنے والی بات کو لبوں پر روک لیا۔ شاہینہ نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ندیم آؤ ناشتہ کر لو۔ تمہارے آفس کا وقت ہو رہا ہے۔ آؤ۔"

شیو، غسل اور ناشتے کے دوران کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ گوہر کا ذہن اگر اپنے ارادوں کی شکست پر پیچ و تاب کا شکار تھا تو ندیم کے سامنے ذکیہ کی صورت تھی۔ وہ صورت جو اس نے اخبار میں دیکھی تھی۔ انتہائی صدمے کے باوجود اب تک اسے کچھ یاد نہ آیا تھا۔ اسے پولیس کی تحقیقات سے بچنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

"گوہر۔" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔ "ندیم کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"اچھا۔" وہ بولا۔ "کیا ان کے لئے دوسری گاڑی کا آرڈر بھی دے دوں۔ اور دوسری ٹائپسٹ کا بھی۔ جو ذکیہ سے زیادہ خوبصورت ہو؟"

✺

ندیم نے گوہر کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا جس پر "چیئرمین" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ عظیم سلک مل کے اس مالک کا کمرہ تھا جو اب معذور پڑا تھا۔ آگے مختلف کمروں پر انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کے ناموں کی تختیاں تھیں۔ اسے اپنے نام کی تختی آخر میں نظر آئی۔ ایک چپراسی نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ مختصر سے کیبن میں بیٹھی ہوئی چالیس پینتالیس برس کی ایک عورت کھڑی ہو گئی۔ "گڈ مارننگ سر۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "گڈ مارننگ۔" اس نے عورت کو پہچانے بغیر کہا۔ اگلا دروازہ اس کے کمرے کا تھا۔ "میں پلانٹ منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت۔" ندیم نے رک کر کہا۔

"یس سر۔" اسکی سیکرٹری نے ایک ٹیلی فون کے دس بٹنوں میں سے ایک دبایا۔ "مسٹر خالق۔ ندیم صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اسی وقت۔" اس نے ریسیور رکھ کے ندیم کی طرف دیکھا۔ "مسٹر خالق آ رہے ہیں سر۔"

اسکا مقصد بھی پلانٹ منیجر کا نام معلوم کرنا ہی تھا۔ وہ سر کے اشارے سے شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وسیع کمرے کی آرائش بڑی خوبصورتی سے کی گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ رکھا تھا اور درمیان میں سنگ مرمر کے رنگ جیسے ٹاپ والی کافی ٹیبل تھی۔ کونے کے بک شیلف میں متعدد کتابیں رسالے اور اخبار پڑے تھے۔ دبیز قالین پر گرد کا ذرہ تک نہ تھا بالکل سامنے اسکی میز تھی جو قوس کی شکل کی تھی۔ اور جس کے گرد چھ کرسیاں رکھی تھیں۔ اسکی اپنی کرسی گھومنے والی تھی اور قوس نما میز کے وسط میں تھی۔ میز پر دائیں جانب دو ٹیلی فون ایک ساتھ رکھے تھے۔ کمرہ ایئرکنڈیشنڈ تھا چنانچہ شنیل کے بھاری پردے کھڑکیوں پر اوپر سے نیچے تک آویزاں تھے۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ دو فولادی الماریاں تھیں۔ بائیں جانب ایک تجوری سی تھی جو کونے میں فرش کے ساتھ نصب تھی۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اس میں بہت سے کاغذات کے علاوہ چابیوں کا ایک گچھا تھا۔ اسے تعجب تھا کہ حالات سے اس حد تک واقف ہو جانے اور اتنا وقت گزر جانے کے باوجود وہ اب تک اپنے ماضی کے سارے رشتے کیوں نہیں جوڑ سکتا۔ وہ کب تک ہر نئی جگہ ہر نئی صورت کو نہ پہچانے گا۔ کب تک اسے کچھ یاد نہ آئے گا۔ اسے کب معلوم ہو گا کہ وہ ندیم شہزاد ہے یا کوئی اور جس نے اسکی جگہ لے لی ہے۔ اسکے گھر پر اسکے بیوی بچوں پر اسکے کاروبار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگر اس میں دوسروں کی مرضی کو دخل تھا تو اسکی اپنی نیت کو زیادہ دخل تھا جس نے اس صورتِ حال کو قبول کیا تھا۔

"ندیم صاحب!" کسی نے پیچھے سے کھنکار کر کہا۔ "آپ نے مجھے یاد کیا تھا؟"

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور بریف کیس بند کر دیا۔ یہ وہی شخص تھا جو اسے گزشتہ شام طارق۔ وڈیرہ ملا تھا۔

"خالق صاحب۔ آیئے!" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ "ذرا زحمت ہو تو میری سیکرٹری کو آواز دے دیجئے۔" اسے سیکرٹری کا نام معلوم کرنے کا اس سے بہتر طریقہ نظر نہ آیا۔ "بلکہ کافی کیلئے کہہ دیجئے۔ تھینک یو!"

"مسز فرہاد!" خالق نے دروازہ کھول کر کہا۔ "ندیم صاحب کیلئے کافی پلیز!" پھر وہ اسکے سامنے آ بیٹھا۔

"مسٹر خالق!" ندیم نے بریف کیس سے سرخ اور نیلی فائلیں نکال کر کہا۔ "آپ نے تو ان کا مطالعہ کیا ہے نا؟ یہ بتلایئے کہ ہنگامی طور پر میں انتظامیہ کے تمام منیجروں کا کوئی اجلاس طلب کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آپ کو انتظامیہ کے منیجر سے کہنا ہوگا۔ مسٹر غضنفر سے! اجلاس تو ایک گھنٹے میں ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "آپ یہ دونوں فائلیں ایک بار پھر دیکھ لیجئے۔ دو بجے اجلاس میں آپ میری وکالت کریں گے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ہے گوہر صاحب یا کوئی اور آپ کی دلیل کو ویٹو نہ کر سکے گا۔ آپ بحث کیجئے۔"

"یس سر۔" خالق نے کہا۔ "میں ان تجاویز پر اپنے ماتحتوں اور دوسرے لوگوں سے اتنی بحث کر چکا ہوں کہ اب مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن انتظامیہ کے سامنے کیس پیش کرنے کے لئے میں پوائنٹ لے لوں گا۔"

خالق کافی پی کر رخصت ہو گیا تو ندیم نے منیجر انتظامیہ غضنفر کے کمرے کا رخ کیا۔ خلاف توقع گوہر کو وہاں دیکھ کر وہ ٹھٹکا مگر اب واپس جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اعظم سلک کے معاملے میں گوہر صاحب سے متفق نہیں۔" غضنفر نے کہا۔

"ہاں۔" ندیم نے کہا۔ "بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اکثریت اس کے حق میں نہیں۔ چیئرمین کے علاوہ۔"

"چیئرمین کا ووٹ میرے پاس ہے۔" گوہر نے کہا۔

"میں لنچ کے بعد انتظامی بورڈ کے تمام منیجرز کا ہنگامی اجلاس طلب کرنے کا نوٹس دینے آیا ہوں۔" ندیم نے کہا۔

"کیوں؟" غضنفر نے کہا۔ "اور اگر میں عرض کروں کہ اتنے کم وقت میں ــــ"

"تو میں یہ اجلاس کسی نوٹس کے بغیر خود طلب کر لوں گا۔ ٹیلی فون پر۔" ندیم نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور آپ کی جگہ کسی مناسب شخص کو انتظامی امور کا منیجر بنا دوں گا جو جنرل منیجر کا حکم اس سے بھی کم وقت میں کسی چوں و چرا کے بغیر پورا کر سکے۔" وہ بات ختم کرتے ہی باہر نکل گیا۔

دو بج کر چالیس منٹ پر انتظامیہ کے سات میں سے پانچ ممبر تجاویز کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے۔ ندیم نے کانفرنس روم سے نکل کر خالق سے ہاتھ ملایا۔ "بہت خوب۔ تم نے کاروبار کو بچا لیا۔"

"تمہیں اب کون بچائے گا ندیم؟" گوہر نے پیچھے آ کر کہا۔ "تم سمجھتے ہو تم مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ جب تم ذکیہ کے قتل کے جرم میں جیل جاؤ گے تو جنرل منیجر کی جگہ غضنفر ہی لے گا۔ میں یہاں سے سیدھا گھر جا رہا ہوں اور شاہینہ کو بتا رہا ہوں کہ تم نے مریم اور عظیم کی مدد سے ذکیہ کے ساتھ کیا گل کھلائے تھے۔ قتل کا سبب وہ خود سمجھ لے گی۔ پھر وہ تمہیں اس گھر میں قدم بھی رکھنے دے تو میرے منہ پر تھوک دینا۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل گیا۔ ندیم نے چاہا کہ وہ اس سے پہلے گھر جا کر شاہینہ کو سب کچھ بتا دے۔ کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے سے قبل ہی اپنی غلطی کا اور اپنی بے بسی کا اعتراف کرے۔ مگر اس کے پاس گاڑی بھی نہ تھی۔ ٹیکسی۔ اسے خیال آیا۔ مگر وہ باہر نکلا تو اندر آتے ہوئے عظیم سے ٹکرا گیا۔

"عظیم!" اس نے کہا۔ "کار کہاں ہے تمہاری؟" پھر اس نے عظیم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ چند منٹ بعد وہ عظیم ہاؤس کی سمت رواں تھے۔ "میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا مگر تم کسی پریشانی میں مبتلا نظر آتے ہو۔" عظیم نے کہا۔

"پھر کبھی سہی!" ندیم کا ذہن غیر حاضر تھا۔ گوہر کی کار اسے پورچ اور گیراج میں نظر نہ آئی۔ پوچھنے پر پھوپھی رشیدہ نے اسے بتایا کہ گوہر طوفان کی طرح آیا تھا اور شاہینہ کو اپنے ساتھ لے کر کہیں گیا ہے۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر باہر آیا۔ جہاں عظیم کار کا انجن اسٹارٹ کئے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہو۔"

"ہاں۔" عظیم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل تم سے ایک سودا کرنا چاہتا تھا جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔"

"کیسا سودا؟" ندیم نے کہا۔ "جو تم نے میرے دستخطوں سے دو چیک ....."

"ہاں...." عظیم نے کہا۔ "دراصل شاید تمہیں یاد ہو کہ اس حادثے کے بعد جس میں وہ لڑکی .... کیا نام تھا اس کا۔ ذکیہ۔ جس وقت وہ ماری گئی تو چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔ کیا تم وہ جگہ دیکھو گے جہاں حادثہ پیش آیا

تھا۔؟"

"ہاں۔" ندیم نے کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جگہ دیکھنے سے اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ جگہ کون سی ہے اور وہ کسی سے یہ بات پوچھ بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ عظیم کی بات نے اسے حیران ضرور کیا مگر وہ چپ رہا۔

آدھے گھنٹے بعد آبادی ختم ہوگئی۔ اب سڑک کے دونوں جانب نمک کے چھوٹے چھوٹے سفید ڈھیر سے نظر آرہے تھے اور کھڑے ہوئے پانی کے قطعے تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے۔ ہوا میں مچھلیوں کی سڑاند تھی اور نمی کے ساتھ ساتھ سمندر کی مخصوص بو محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا کار ضرور مل جاتی تھی ورنہ سڑک پر آدمی کا نشان تک نہ تھا۔ بالآخر افق پر دھبے سے نمودار ہوئے جنہوں نے مکانوں کی طویل قطار کی شکل اختیار کرلی اور پس منظر میں اچانک سمندر آگیا۔ سڑک گھوم کر ساحل کے ساتھ بنی ہوئی لکڑی کے مکانوں اور کاٹیجوں کے عقب میں چلتی گئی۔ پھر سمندر کے ساحل کے ساتھ دائیں ہاتھ پر چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سڑک بائیں جانب بل کھا کے پھر سیدھی ہوگئی مگر عظیم نے کار کو سیدھا جانے دیا اور سڑک چھوڑ کر ایک چٹان کے کنارے پر گاڑی کو روک لیا۔ ندیم نیچے اتر آیا۔ چٹان کے آخری کونے کے نیچے سمندر کی موجیں ٹوٹ رہی تھیں۔

"یہ ہے وہ مقام جہاں کار بائیں ہاتھ کو گھوم کر اس چٹان پر آئی اور نیچے جا گری۔" عظیم نے کہا۔ "میں جب تمہیں لینے آیا تو تم اسی چٹان پر ہونق بنے کھڑے تھے۔ پانی میں تر اور..."

"تم.... مجھے یہاں سے تم لے گئے تھے۔؟" ندیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہ اب تک اس سڑک اور اس چٹان اور اس کے نیچے پہنچ کر منتشر ہوجانے والی لہروں پر تھی۔ جنہوں نے مل کر ایک لڑکی کو مار دیا تھا۔

"ہاں... تم نے مجھے کسی ہٹ سے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ اس بات کا مریم کو بھی پتا نہ چلے۔ یعنی یہ کہ تم کہاں سے بول رہے ہو۔" عظیم نے کہا۔ ندیم کے ذہن میں ہنوز وہ خلا تھا جس میں اس حادثے کی کوئی یاد موجود نہ تھی۔ اس جگہ کو دیکھ کر بھی اس نے کچھ محسوس نہ کیا تھا۔ اس کے لاشعور میں دفن اندھیرے کو کسی ہلکی سی کرن نے بھی روشن نہ کیا تھا۔ بس اس کی روح پر ایک لڑکی کی موت کی ذمہ داری کا بوجھ تھا جو دنیا نے اس پر رکھ دیا تھا۔

"اور کیا کہا تھا میں نے؟" ندیم نے کھوکھلی آواز میں پوچھا۔ اسے اپنی بے حسی اور بے بسی پر رنج ہوا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم اپنی حماقت سے کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے تھے جس سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔" عظیم نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ مجھے میٹروپول کے قریب اتار دو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کے ڈرگ روڈ پر مڑ گیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ حادثہ اس لئے پیش آیا کہ تم نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ گاڑی موڑ پر قابو سے باہر ہوکر سیدھی گئی اور نیچے جا پڑی۔" عظیم نے کہا۔

"کیا تم یہی بات بتانے کے لئے آئے تھے۔" ندیم نے بے خیالی میں پوچھا۔

"ہاں۔ دیکھو ندیم ہم دونوں ہی ایک کشتی میں سوار ہیں۔ میرے گواہ تم ہو اور تمہارا گواہ میں ہوں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہ کہیں تو دونوں محفوظ رہتے ہیں۔ تم وہ جعلی چیک والی بات بھول جاؤ۔ میں تمہارے ٹیلی فون کو اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کو بھول جاتا ہوں۔" عظیم خفت سے ہنسا۔ "اس کے علاوہ مجھے دس ہزار روپے مزید درکار ہیں جو تمہارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میرا مطلب ہے عزت اور زندگی کے مقابلے میں۔"

"تمہیں معلوم ہے میرے حساب سے تم نے پہلے کتنی رقم نکالی تھی۔" ندیم نے کہا۔ "اور اب میرے پاس کیا بچا ہے۔"

"بچنے کی بھلا کونسی بات ہے۔ تم اتنے بڑے کاروبار کے مالک ہو جو تمہاری بیوی کا ہے وہ بھی تو تمہارا ہی ہے۔" وہ بے شرمی سے ہنسا۔

ندیم کا دل چاہا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ کر اسی چٹان سے نیچے پھینک دے مگر اس کے سامنے مریم کا مظلوم چہرہ آگیا۔

"اچھا...!" اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "میں سوچوں گا۔ فی الحال مجھے شاہینہ کی فکر ہے۔ واپس گھر چلو۔"

عظیم نے اپنی گاڑی دروازے پر ہی روک لی۔ "میں یہیں انتظار کروں گا۔ مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔"

ندیم گاڑی سے اتر کر اندر پہنچا ہی تھا کہ اسے گوہر نظر آگیا۔ "تم؟" وہ آگ بگولا ہو کر اس کی طرف لپکا۔ "ذلیل کتے تم میں اب بھی ہمت ہے ہمیں منہ دکھانے کی۔" ندیم اسکے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ چنانچہ گوہر کا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ پیچھے ہٹا اور جھاڑیوں سے الجھ کر گر پڑا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے گوہر کے بوٹ کی ٹھوکر اسکے پیٹ میں لگی۔ "کون تھا وہ کرائے کا قاتل جس سے تم نے اپنی بیوی کو اور مجھے قتل کرانا چاہا تھا۔ بے غیرت۔ بے ضمیر جس کا دیا کھاتا ہے اسی کی جان لینا چاہتا ہے۔" گوہر کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈا۔

ندیم بالآخر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ "بکواس بند کرو۔" وہ آگے بڑھا تو گوہر نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ "خیریت چاہتے ہو تو الٹے پاؤں لوٹ جاؤ۔ شاہینہ زخمی ہے اور تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"
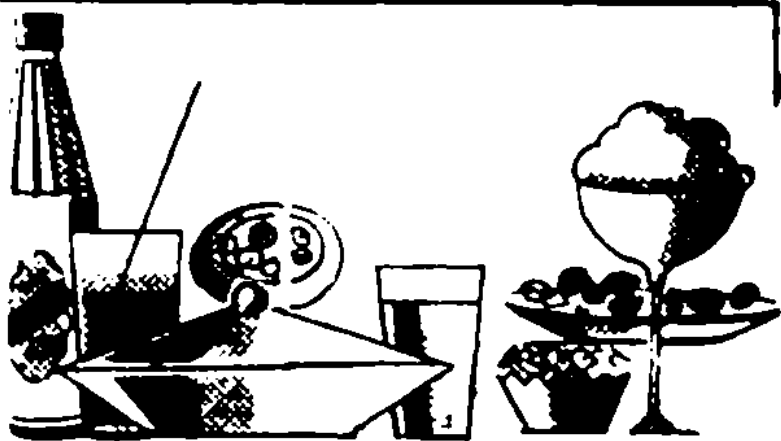
"شاہینہ کیسے زخمی ہوئی؟" ندیم نے ریوالور کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہ اس الو کے پٹھے سے پوچھو جس نے کار ٹکرا کے مجھے سڑک سے نیچے الٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لنگڑا حرامزادہ۔ اسکی کھٹارا نیلی کار کا کیا بگڑنا تھا۔ میری گاڑی کا ناس کر دیا اس نے۔ میں پولیس کو رپورٹ کر کے آیا ہوں۔ دیکھتا ہوں وہ اور تم بچ کے کہاں جاتے ہو؟" گوہر نے دھاڑ کر کہا۔

ندیم واپس ہو گیا۔ اس کے ذہن میں گزشتہ شب کی بات تھی۔ وہ اس نیلی کار والے لنگڑے کو جانتا تھا جس نے اسے دھمکی دے کر کہا تھا "تمہارے ساتھ بھی یہی ہو گا۔"

"عظیم!" اس نے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیا زکیہ کا شوہر لنگڑا ہے اور کیا اس کے پاس نیلے رنگ کی پرانی ڈاٹسن ہے۔؟" عظیم کا اقرار اس کے لئے غیر متوقع نہ تھا۔

○

وہ نیلی کار طارق روڈ کے متوازی چلنے والی گلی میں کھڑی تھی۔ اس پر پڑے ہوئے ڈینٹ بالکل نئے تھے۔ کار کی چادر دو جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور بمپر مڑ گیا تھا۔ بائیں جانب سے سارا پینٹ خراب ہو گیا تھا اور دروازہ اندر دب گیا تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر بٹن دبایا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس نے گزشتہ شب اسے دھمکی دی تھی۔ "تم نے میری بیوی کی کار کو ٹکر مار کر الٹنے کی کوشش کیوں کی تھی۔" ندیم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ حادثہ تھا مسٹر۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "گاڑیاں ٹکرا ہی جاتی ہیں۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ کل شام تم مجھ سے کیا کہہ کر بھاگے تھے۔ یاد ہے؟" ندیم نے اسکی معذوری کا لحاظ کرتے ہوئے غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"تمہاری بیوی مری تو نہیں ہے۔" وہ چلایا۔ "میری طرح معذور تک نہیں ہوئی ہے۔ گلہ کس بات کا ہے پھر؟ تم تو اس سے زیادہ سزا کے مستحق تھے۔"

"کس بات کی سزا؟" ندیم نے حیرانی سے کہا۔ "میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔"

"تم پیسے والے کتنے بے ضمیر ہوتے ہو۔" اس نے اچانک ندیم کے منہ پر تھوک دیا۔ ایک لمحے کے لئے غصے نے ندیم کو پاگل کر دیا۔ دوسرے لمحے اسکا اٹھا ہوا ہاتھ چہرے سے تھوک صاف کرنے لگا۔ اگر یہ شخص پاگل ہے تو کیا۔ میں تو ہوش میں ہوں۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ میں تو معذور نہیں ہوں۔

"کیا اس رات اپنی شادی کی سالگرہ کا جشن تم اپنے گھر نہیں منا سکتے تھے؟ کیا یہ ضروری تھا کہ تم اسے لے کر اپنی شادی کا جشن منانے نکلتے؟ تم نے نہیں تمہاری دولت نے اسے مجھ سے چھینا۔ وہ تمہاری ٹائپسٹ تھی۔ داشتہ تو نہیں تھی۔ مگر وہ تمہاری دولت کے اور تمہارے محلوں کے اور عیش و عشرت کی اس زندگی کے خواب دیکھنے لگی تھی جو تم گزارتے ہو۔ میں جانتا تھا وہ ہر وقت تمہاری باتیں کرتی تھی۔ یکلخت تمہاری دولت میری محبت پر غالب آ گئی تھی۔ آخری بار وہ تمہارے ساتھ گئی تھی اور تم نے اسے مار دیا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں بھی تمہیں مار دیتا۔ لیکن میں تمہیں وہ سزا دینا چاہتا ہوں جو تم نے مجھے دی۔ میں تمہاری بیوی کو مار دوں گا۔ تم اس سے محبت کرتے ہو نا۔ محبت نہ کرتے تو اتنے پریشان نہ ہوتے۔ میں تمہاری زندگی اپنی طرح عذاب بنا دوں گا۔" وہ دیوار کا سہارا لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اب بات ندیم کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ ندیم شہزاد کوئی اور تھا۔ اپنی شادی کی سالگرہ والے دن وہ نشے میں گھر سے نکل گیا اور اسے کہیں اپنی وہ ٹائپسٹ مل گئی جو پہلے ہی اس پر فریفتہ تھی اور اسکی باتیں کر کے ہر روز شوہر سے مار کھاتی تھی کیونکہ معذور اور غریب شوہر حاسد تھا اور ندیم شہزاد کا ذکر تک اسے گوارا نہ تھا لیکن زکیہ محبت کے راستے کو چھوڑ کر دولت کے راستے پر چل پڑی تھی۔ وہ واپس نہیں آ سکتی تھی۔ وہ ہر روز مار بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ وہ اس لنگڑے اور غریب موٹر میکنک کے ساتھ آدھے فلیٹ میں بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ باقی آدھے میں مریم رہتی تھی جسکے شوہر کے پاس فاکس ویگن تھی اور جن کے حالات بہت زیادہ نہ سہی لیکن ان سے بہرحال بہتر تھے۔ چنانچہ اس نے ندیم شہزاد کے دکھلائے ہوئے سبز باغ میں قدم رکھ دیا۔ وہ اس کے پھیلائے ہوئے سنہرے جال میں پھنس گئی اور اس عیاش شرابی نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے ساحل سمندر کے ویران علاقے کا رخ کیا مگر نشے کے باعث اس چکر میں پڑ گیا۔ اصل ندیم شہزاد شاید خوف کے باعث فرار ہو گیا یا اسکی لاش سمندر میں دور نکل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ عظیم نے فون کرنے کی اور اسے ہمراہ لے جانے کی ساری کہانی اس سے دس ہزار روپے اینٹھنے کے لئے گھڑی تھی۔ فراڈ کے الزام سے بچنے کے لئے ایجاد کی تھی۔ اسکے پاس صرف ایک سوال کا جواب نہ تھا۔ اگر وہ ندیم شہزاد نہیں تو کون ہے اور اس روز بھیگے ہوئے سوٹ سمیت وہ اچانک ریکس سینما کے چورا ہے پر کہاں سے نمودار ہو گیا تھا۔ اس کا گھر کہاں ہے؟

آہستہ آہستہ وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ عظیم اسکے انتظار میں تھا۔ "ندیم!" وہ بولا۔ "تم..... تم وہ چیک لائے ہو یا نقد دو گے۔

میرا مطلب ہے دس ہزار۔"

ندیم ہنسا۔ "چیک؟ دس ہزار کا چیک؟ جعلی یا اصلی؟ نہیں عظمیٰ۔ یہ چیک بھی نہیں ہیں اور نقد رقم بھی نہیں ہے۔ اب صرف سزا باقی ہے اور تم نے کہا تھا نا کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم اکٹھے ہی جیل جائیں گے۔ کیا خیال ہے۔" وہ پھر ہنسا۔ اسکی روح پر سے ایک بوجھ ضرور اتر گیا تھا کہ اس نے ذکیہ کو قتل کیا۔ الزام ابھی باقی تھا۔

وہ "اعظم ہاؤس" پہنچا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گھر میں صرف پھوپھی رشیدہ تھیں۔ "ندیم بیٹے۔" پھوپھی رشیدہ نے کہا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ گوہر نے جو کچھ کہا ہے غلط ہے۔ میں جانتی ہوں وہ تمہارا دشمن ہے۔"

"پھوپھی جان۔" ندیم نے کہا۔ "میں نے کاروبار کی فروخت کے معاملے میں ایک اور رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔ آج مل کی انتظامیہ نے میری وہ تجاویز اکثریت سے منظور کر لی ہیں جن کا تعلق کاروبار کو نئے سرے سے منظم کرنے سے ہے۔"

"ندیم۔" پھوپھی رشیدہ نے سرگوشی میں کہا۔ "کاروبار کو فروخت مت ہونے دینا بیٹے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور مجھے معلوم ہے اعظم اگر معذور نہ ہوتا تو اس بات پر گوہر کو عاق کر دیتا۔ اسے تو خبر بھی ملی تو وہ صدمے سے مر جائے گا۔"

"شاہینہ کہاں ہے پھوپھی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

پھوپھی رشیدہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بڑی ضدی اور خود سر لڑکی ہے ندیم۔ تم جانتے ہی ہو۔ وہ ایک بار فیصلہ کر لے تو مشکل ہی سے بدلتی ہے۔ وہ تم سے بات نہیں کرے گی۔ اسے کمال لے گیا ہے۔"

"کمال؟" اس نے زیر لب دہرایا۔ "پھوپھی اماں کیا کمال کی شادی ہو چکی ہے۔؟"

"کیسی بات کرتے ہو بیٹا۔" پھوپھی رشیدہ نے تعجب سے دیکھا۔ "سارے خاندان نے زور لگا لیا اسکی شادی کے لئے تو۔ ایک سے ایک اچھا رشتہ آیا مگر اس نے اپنی قسم نہ توڑی۔"

رقابت اور حسد کی آگ آہستہ آہستہ اس کے وجود کو اندر سے جلانے لگی۔ "پھوپھی رشیدہ۔ آپ کمال سے بات کرا دیں میری۔"

"کمال۔" ندیم نے نمبر ملتے ہی کہا۔ "کیا شاہینہ تمہارے ساتھ ہے؟"

"ہاں۔" کمال نے کہا۔ "تم نے آج اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔؟"

"یہ جھوٹ ہے کمال۔ اسے ذکیہ کے شوہر نے مارنا چاہا تھا۔" ندیم نے کہا۔ "وہ نیلی ڈاٹسن اسی کی تھی وہ موٹر میکنک ہے۔"

"ندیم۔" کمال نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میری سمجھ میں تمہاری یادداشت کھو جانے والی بات بھی نہیں آئی تھی اور یہ بات غلط بھی مگر تم اپنی اداکاری سے مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے تم ڈاکٹر ہارون سے یا ڈاکٹر ذکی حسن سے ملو۔"

"اس مشورے کا شکریہ۔ لیکن کمال۔ شاہینہ کی جان خطرے میں ہے۔ ذکیہ کا شوہر پاگل ہو رہا ہے۔ وہ کہتا ہے جیسے میں نے اسکی بیوی کو مار کر اسکی زندگی عذاب کر دی ہے ایسے ہی وہ شاہینہ کو مار کے مجھے سزا دے گا۔ تم اسے احتیاط سے گھر لے آؤ۔" ندیم نے ضبط کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھوپھی رشیدہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ "یہ تم کس کی بات کر رہے تھے ندیم۔ کون مارنا چاہتا ہے شاہینہ کو۔ تم نے کیوں مارا تھا اسکی بیوی کو۔"

"میں نے نہیں مارا تھا پھوپھی رشیدہ۔" ندیم نے کہا۔ "وہ دیوانہ سمجھتا ہے اسکی موت کا میں ذمہ دار ہوں۔"

"بیچارا۔" پھوپھی رشیدہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ "معلوم نہیں کیوں میرا یہ عقیدہ ہے کہ آدمی کو اس کے ہر گناہ کی سزا اسی زندگی میں مل جاتی ہے کبھی کم کبھی زیادہ۔ جیسا اسکا گناہ ہو۔ جنت اور جہنم آدمی کی اپنی زندگی کے اچھے برے دن ہیں۔ مجھے اعظم پر بھی ترس آتا ہے۔ یہ سب اس بے زبان کی بد دعا ہے۔"

ندیم بھونچکا رہ گیا۔ "آپ کس بے زبان کی بات کر رہی ہیں پھوپھی رشیدہ۔؟"

"شاہینہ کی ماں کی اور کس کی۔ کیسی اچھی اور شریف خاندان کی لڑکی تھی وہ۔ جاہل تھی تو کیا۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو قرآن پڑھانے اور امور خانہ داری سکھانے کے علاوہ اور پڑھایا بھی کیا جاتا ہے۔ انہیں محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور کلب ہوٹلوں میں آنا جانا کہاں آتا تھا۔ یہی اس کا قصور بن گیا کیونکہ اعظم نے دولت کے ساتھ سوسائٹی میں مقام حاصل کرنے کی کوشش کی بھی تھی اور بیچاری اعظم کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اپنے پرانے طریقوں پر کاربند تھی اور اعظم کو اپنا سرتاج اور مجازی خدا سمجھتی تھی۔ اس نے اعظم کو شراب پینے سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی لیکن اعظم نے ضد میں گھر کے اندر پینی شروع کر دی اور آوارہ عورتوں کو لے کر گھر میں آنے لگا۔ وہ اپنے لئے نہیں اپنے بچوں کے لئے اس سے لڑ گئی۔ نتیجہ یہ کہ اعظم ہر روز اسے بے رحمی سے مارنے لگا۔ وہ خدا کی بندی بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ میں جان دے دوں گی لیکن بچوں کے اخلاق اور کردار پر برا اثر نہ پڑنے دوں گی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن اعظم نے نشے میں اسے گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی۔ شاہینہ اس وقت چھ برس کی تھی۔ گوہر دو سال کا تھا۔ بچی نے ماں کو بچانے کے لئے چیخ و پکار مچائی اور باپ کو الگ کرنا چاہا مگر نشے

میں وحشت مرد کے سامنے اس بچی کی کیا چلتی۔ بس اللہ کو بچانا منظور تھا جو اسکی چیخیں سنکر محلے کے لوگ آ گئے اور انہوں نے اعظم کے ہاتھوں ایک بے گناہ کا خون ہونے سے بچا لیا۔ وہ دو تین مہینے ہسپتال میں رہی مگر ہوش میں آنے پر اس نے اعظم کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا پھر اسکے بھائی اسے لاہور لے گئے۔ شاہینہ کے ذہن پر بچپن کے اس واقعے کا گہرا اثر ہے۔ وہ ہر مرد کو ظالم اور عیاش سمجھتی ہے۔ بہت جلد بدگمان ہو جاتی ہے۔ اعظم نے کوشش کی تھی کہ کاروبار میں اس کے پندرہ فیصد حصص ختم کردے۔ مگر ہم نے اسکی نہ چلنے دی اور اسکی بیوی کے بھائی بھی اڑ گئے۔ بچوں کے معاملے پر بھی بڑی مقدمے بازی ہوئی۔ شاہینہ ماں کے پاس رہی۔ گوہر باپ کے پاس۔ جب شاہینہ کی ماں نے دوسری شادی کی تو شاہینہ بھی باپ کو مل گئی۔"

"اور اب وہ کہاں ہے؟ یعنی شاہینہ کی ماں۔" ندیم نے پوچھا۔

"اس کا دوسرا شوہر بزنس مین ہے۔ وہ گلستان کالونی میں رہتی تھی۔ اپنے ایک بھائی کے ساتھ اب انہوں نے شادمان کالونی میں بڑا شاندار مکان بنوایا ہے۔ ادھر اعظم کو دیکھ لو اتنی دولت ہے۔ عیش و آرام کے اتنے سامان ہیں مگر زندگی ایک سزا بن گئی ہے۔ فالج نے اٹھارہ ماہ سے نہ زندوں میں رکھا ہے نہ مردوں میں۔ گوہر جیسی ناخلف اولاد ملی ہے جو عمر بھر کی محنت کی کمائی کو چوپٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے تو تمہارا ابھی بڑا رنج تھا کہ داماد بھی ملا تو وہ جو اسی کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ شراب کا اور عورت کا رسیا۔ شاہینہ کی زندگی تلخ تھی۔ میں تو اب تمہیں دیکھ کر حیران ہوں۔ تم بالکل بدل گئے ہو۔ شراب ہی نہیں چھوڑی بلکہ کاروبار میں بھی دلچسپی لیتے نظر آتے ہو۔ میرے دل سے تو تمہارے لئے دعا نکلتی ہے۔ تم نہیں کرو گے بیٹا تو گوہر سے لڑنے کی بھلا کس میں ہمت ہے۔؟ جیسے بھی ہو اعظم کو اس صدمے سے بچالو۔ کاروبار اس کی زندگی تھا۔ اسکے بغیر وہ مر جائے گا۔" پھوپھی رشیدہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آپ مطمئن رہیں پھوپھی رشیدہ۔ گوہر نے ان کی معذوری کو بہانہ بنالیا ہے لیکن میں ان کی مرضی معلوم کرلوں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ندیم۔ وہ غریب تو نہ سن سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔" پھوپھی رشیدہ نے مایوسی سے کہا۔

"آپ میرے ساتھ آئیں۔" ندیم نے کسی فوری خیال کے تحت کہا۔

اعظم صاحب اپنے بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ندیم کو آتے دیکھ کر صرف ان کی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔ ڈاکٹر بستر کے ایک طرف کھڑا تھا اور نرس دوسری طرف تھی۔ انہیں آتا دیکھ کر وہ مستعد ہو گئے تھے۔ ندیم ان کے پیروں کی جانب ایک طرف بیٹھ گیا۔ پھوپھی رشیدہ دوسری طرف۔ ندیم نے اعظم صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فوری طور پر اسے اعظم صاحب کی آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی چمک محسوس ہوئی۔ ان کی انگلیاں ندیم کے ہاتھوں میں کانپنے لگیں۔ یوں جیسے وہ ندیم کا ہاتھ تھام کر کسی جذبے کے اظہار کی راہ تلاش کر رہی ہیں کوئی جذبہ۔ مسرت کا یا شکر گزاری کا۔ حیرت کا یا ندامت کا۔ خوف، بے بسی اور اپنی معذوری کے اعتراف کا۔ اتنا اندازہ بہرحال ندیم کر سکتا تھا کہ یہ جذبہ اس کا مخالف نہیں ہے۔ اس میں برہمی یا نفرت یا بیزاری شامل نہیں ہے۔ ندیم نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس کے ایک صفحے پر کچھ لکھتا رہا۔ پھر اس نے وہ صفحہ پھاڑ کے اعظم صاحب کی آنکھوں کے بہت قریب کر دیا۔ ان کی آنکھوں کی پتلیوں کی گردش سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ تحریر کو پڑھ رہے ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ ندیم کی ہتھیلی پر بالکل سیدھا رکھا ہوا تھا اور ندیم کی نظریں اعظم کی صورت پر نہیں اس ہاتھ کی انگلیوں پر تھیں۔ اچانک اعظم صاحب کی انگشت شہادت تھوڑی سی اوپر اٹھی اور ندیم کی ہتھیلی پر گر گئی۔ ندیم کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ انگلی دوسری بار اٹھی اور جھک گئی۔ اعظم صاحب نے اسکی بتائی ہوئی اشاروں کی محدود زبان میں ایک سوال کا جواب انکار میں دیا تھا۔ اس نے وہ پرچہ اعظم صاحب کے ہاتھ سے لے کر ڈاکٹر کو پکڑا دیا۔ "ڈاکٹر صاحب اس پرچے کو غور سے پڑھیے کیونکہ جو کچھ اب میں آپ کے سامنے کرنے والا ہوں اس کا تعلق ایک انتہائی اہم قانونی معاملے سے ہے اور آپ اس کے سب سے اہم گواہ ہیں۔"

ڈاکٹر نے پرچہ لے لیا۔ اس میں لکھا تھا "انکل اعظم۔ مجھے آپ سے چند اہم سوال کرنے ہیں۔ یہ ہم سب کی بدنصیبی ہے کہ آپ اپنی زبان سے جواب نہیں دے سکتے لیکن جواب بہت ضروری ہیں۔ کچھ لوگ آپ کے کاروبار کو فروخت کرنے کی فکر میں ہیں اور آپ کی معذوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اس میں آپ کی مرضی شامل ہے۔ اب اگر آپ میرے سوالات کا جواب دے سکیں تو میں کاروبار کو بچانے کی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ اگر جواب ہاں میں ہو تو اپنی انگلی صرف ایک بار اٹھایئے جواب انکار میں ہو تو انگلی کو دو مرتبہ اٹھایئے اور اب یہ بتایئے کہ کیا واقعی آپ کاروبار کو فروخت کرنا چاہتے ہیں؟"

اعظم صاحب نے اسکا جواب دیدیا تھا۔ "نہیں"

اس نے ایک اور پرچے پر لکھا۔ "کیا آپ پسند کریں گے کہ گوہر آپ کی زندگی میں چیئرمین کے اختیارات سنبھال لے" یہ پرچہ بھی اس نے اعظم صاحب کے سامنے کردیا۔ اعظم صاحب کی انگلی نے دوبارہ اٹھ کر "نہیں" کہا۔ اس کامیابی نے ندیم کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس نے تیسرا سوال لکھا۔ "کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں کاروبار کی فروخت کو روکنے کے لئے قانونی اقدامات کروں؟" جواب اثبات میں ملا۔

"کیا آپ اس وصیت نامے کو بدلنا چاہتے ہیں جس میں مجھے چیئرمین بنانے کی شق موجود ہے"

"نہیں" اعظم صاحب نے ایک انگلی کو دوبارہ اٹھا کر جواب دیا۔

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ کاروبار آپ کے نام سے چلتا رہے؟"

"ہاں" انگشت شہادت نے کہا۔

"ندیم نے آخری جملہ لکھا۔ "آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا کیا آپ کسی مجسٹریٹ کی موجودگی میں اپنا بیان اسی طرح لکھوا سکیں گے؟"

"ہاں" اعظم صاحب نے انگلی اٹھا کر اعتماد کے ساتھ کہا۔

ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ "ڈاکٹر۔ کیا آپ یہ تصدیق کر سکتے ہیں کہ جسمانی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود اعظم صاحب کے ہوش و حواس برقرار ہیں۔ اسکا عملی مظاہرہ آپ دیکھ چکے ہیں"

"اس مظاہرے کے بغیر بھی میں اسکی تصدیق کر سکتا تھا ندیم صاحب" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن میں آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے اعظم صاحب کے مردہ جسم کی انگلیوں کو زبان بنالیا جن میں ابھی تھوڑی سی جان باقی تھی"

پھوپھی رشیدہ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا "ندیم" انہوں نے باہر آکر جذباتی لہجے میں کہا۔ "اعظم نے اپنے گناہوں کی بہت کڑی سزا پائی ہے۔ تم نے اسے سکون سے مرنے دیا تو خدا تمہیں اسکا اجر دے گا۔ مجھے یقین ہے تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ میری دعا ہے تم کامیاب ہو جاؤ"

کسی گاڑی کے باہر رکنے کی آواز سن کر وہ سمجھ گیا کہ شاہینہ واپس آگئی ہے۔ وہ اسکی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے میں جارہی تھی کہ ندیم نے اسکا راستہ روک لیا۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

"مگر میں اب کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے گوہر نے بتادیا ہے کہ تم نے یادداشت کے کھو جانے کا یہ چکر کیوں چلایا ہے" وہ سرد اور سخت لہجے میں بولی۔ "یہ میری خوش فہمی تھی ندیم کہ تم بدل گئے ہو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم نے یہ روپ مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے بدلا ہے۔ یکلخت تم نے شراب چھوڑ دی تھی۔ گھر کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مجھ سے اور خرم سے محبت کی وہ باتیں کرنے لگے جو ہم نے تمہاری زبان سے آٹھ برس پہلے آخری بار سنی تھیں۔ یہ ہمارا اعتماد حاصل کرکے ہمیں ٹھکانے لگانے کی کوشش تھی مگر ندیم میں ذکیہ نہیں ہوں"

"شاہینہ مجھے معلوم ہے گوہر نے تم سے میرے بارے میں کیا کچھ کہا ہوگا" ندیم نے وضاحت کرنی چاہی۔

"گوہر کو چھوڑو۔ کیا میں خود نہیں سمجھتی کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ اگر تمہیں واقعی کچھ یاد نہیں تھا تو تم نے مجھے اپنی بیوی کیسے مان لیا؟ کیا جواز تھا تمہارے پاس میری خوابگاہ میں موجودگی کا؟ صرف یہ کہ میں عورت تھی۔ اور عورت تمہارے لئے صرف عورت ہے۔ خواہ وہ ذکیہ ہو یا کوئی اور۔ بیوی نہیں تو نہ سہی۔ جاؤ" وہ نیم ہسٹریائی انداز میں چلائی۔

"ندیم" بیرسٹر کمال نے پہلی بار لب کھولے۔ "میں نے ڈاکٹر ہارون کو بلایا ہے"

"کس کے لئے؟" ندیم نے پلٹ کر کہا۔ "میرے لئے شاہینہ کے لئے یا اعظم صاحب کے لئے؟"

"میرے خیال میں تمہاری ذہنی حالت. . ." کمال نے کہا۔ "ویسے شاہینہ بھی. . ."

"نہیں، بیرسٹر کمال۔ ابھی میں نے ایک ڈاکٹر کی موجودگی میں اعظم صاحب سے گفتگو کی ہے۔ وہ کاروبار کو فروخت کرنے کے خلاف ہیں۔ اچھا ہوا جو تم آگئے"

"تمہارا ذہن یہ قبول کرتا ہے کہ ہم سب اتنے بڑے جھوٹ کو سچ مان لیں گے؟" کمال نے متانت سے کہا۔

"یہ ایک انتہائی اہم قانونی معاملہ ہے بیرسٹر کمال۔ اور تم اعظم سلک مل کے قانونی مشیر ہو۔ ڈاکٹر ہارون ایک ماہر نفسیات اور ذہنی امراض کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ان دو گواہوں کی موجودگی میں اعظم صاحب اپنا بیان دیں گے۔ ضرورت ہوئی تو کل یہ بیان مجسٹریٹ کی موجودگی میں ریکارڈ ہوگا ورنہ تمہاری اور ڈاکٹر ہارون کی گواہی ہم سب کی گواہی سے زیادہ مستند اور قابل قبول ہوگی" ندیم

نے کہا۔

ندیم کو گوہر کے آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ وہ اچانک سامنے آگیا۔ "تم اب یہاں کوئی چکر نہیں چلا سکتے شاہینہ اپنے حصص فروخت کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے۔"

"لیکن اعظم صاحب کاروبار فروخت کرنے پر تیار نہیں۔ میں نے ان سے خود پوچھا ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ وہ گزشتہ اٹھارہ ماہ سے معذور ہیں۔" گوہر نے چیخ کر کہا۔ "اور تم کون ہوتے ہو اس گھر کے معاملات میں مداخلت کرنے والے نکل جاؤ یہاں سے اسی وقت۔ ایک بار نکالے جا چکے ہو پھر کیوں آگئے بے غیرت۔"

"میں اس گھر کا اور کاروبار کے مالک مسٹر اعظم کا داماد ہوں گوہر۔" ندیم نے کہا۔ "جب تک شاہینہ میری قانونی بیوی ہے تم مجھے اس گھر سے نہیں نکال سکتے۔ آج دن میں بھی تم نے مجھ پر ریوالور نکال لیا تھا لیکن اس وقت چونکہ مجھے جانا تھا اس لئے میں چلا گیا تھا لیکن اب اگر تم نے مجھ سے بدتمیزی سے بات بھی کی تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ زبان سنبھال کر بات کرنا مجھ سے۔"

باہر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ پھر ایک خادم ڈاکٹر ہارون کے ساتھ ان کا بیگ لئے نمودار ہوا۔

"ڈاکٹر ہارون۔" ندیم نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ "آپ ایک مریض کی ذہنی کیفیت کے بارے میں فیصلہ دیں گے کہ وہ ذہنی طور پر نارمل ہے یا نہیں۔ میرے ساتھ آیئے۔ بیرسٹر کمال آپ کی موجودگی قانوناً ضروری ہے۔"

گوہر کو احتجاج کا یا مداخلت کا موقع ہی نہ ملا۔ بیرسٹر کمال اور ڈاکٹر ہارون کے علاوہ پھوپھی رشیدہ اور حیرت زدہ شاہینہ بھی ندیم کے ہمراہ اعظم صاحب کے کمرے کا رخ کر چکے تھے۔

اس بار ندیم نے اپنے سوالات کو ترتیب وار الگ الگ کاغذ پر لکھا۔ اس نے وضاحت کی کہ اعظم صاحب ان سوالات کے جواب کیسے دیں گے۔ گوہر کے لئے یہ سب اس حد تک ناقابل یقین تھا کہ وہ کچھ نہ بول سکا۔ آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد اعظم صاحب سے ہر ضروری سوال کا جواب "ہاں" یا "نہیں" کی صورت میں لیا جا چکا تھا۔ انہوں نے کاروبار کی فروخت روک دی تھی۔ وصیت نامے کی رو سے ندیم کو چیئرمین کے اختیارات سنبھالنے کی اجازت دی تھی۔ اس گھر پر اسکا حق ملکیت تسلیم کیا تھا اور اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ شاہینہ اور پھوپھی رشیدہ اپنے حصص فروخت نہ کریں اور معاملے میں ندیم کے فیصلے کو تسلیم کریں۔ گوہر کے لئے اب خاموش رہنا ناممکن تھا۔ اس نے اس پورے معاملے کو فراڈ اور ڈرامہ قرار دیا اور اعظم صاحب کے بیان کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر جیسے جیسے اعظم صاحب ہر صفحے پر لکھے ہوئے ایک سوال کا جواب دیتے گئے ندیم ہر صفحے پر ڈاکٹر ہارون کے اور بیرسٹر کمال کے دستخط بطور گواہ لیتا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر ہارون نے یہ سرٹیفکیٹ بھی دیا کہ جسمانی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود اعظم صاحب کی ذہنی صلاحیت متاثر نہیں ہوئی ہے۔ ندیم نے یہ سارے کاغذات سمیٹ لئے۔

"ندیم۔" گوہر نے نیم دیوانگی کی حالت میں کہا۔ "میں نے ابھی شکست قبول نہیں کی ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" پھر وہ اپنے باپ کی طرف پلٹا۔ "ڈیڈی۔ تم نے ہمیشہ مجھے برا سمجھا ہے۔ ہمیشہ میری مخالفت کی ہے۔ لیکن اب تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم یہاں پڑے ایڑیاں رگڑتے رہو گے اور میں تم سے ہر زیادتی کا انتقام لوں گا۔ میں تمہیں بڑے عذاب کی موت دوں گا۔ تم بھی . . ." اسکا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی شاہینہ اور پھوپھی رشیدہ نے ایک ساتھ چیخ ماری۔ "گوہر" لیکن گوہر نکل گیا تھا۔

ندیم نے ڈاکٹر ہارون اور بیرسٹر کمال کے سامنے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا۔ اسنے خود کو سمجھایا کہ اعظم صاحب نے گوہر کا کہا ہوا ایک لفظ نہیں سنا۔ سننے والے وہ لوگ تھے جو صورت حال کو سمجھتے تھے اور گوہر نے ان سب کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔

"شاہینہ۔" ندیم نے سب کے چلے جانے کے بعد کہا۔ "ذکیہ کو میں نے قتل نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے اس سے میرا کوئی تعلق بھی نہیں تھا لیکن سر دست میں کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔ شاید کسی دن مجھے سب یاد آجائے گا۔ لیکن تب تک میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔"

شاہینہ نے اسکی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

⊕

"ندیم صاحب۔" انسپکٹر نے کہا۔ "آپ کے خیال میں وہ معذور شخص آپ کی بیوی کو اس لئے قتل کرنا چاہتا ہے۔ کہ آپ نے اس کی بیوی ذکیہ کو قتل کیا۔ اس کے یقین کا کوئی تو سبب ہوگا۔"

"آپ جانتے ہیں ذکیہ ڈبل نمونیہ کا شکار ہو کر مری ہے۔" ندیم نے کہا۔

"جی۔ اور ڈبل نمونیہ اسے کیسے ہوگیا تھا؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا اور فائل کے چند صفحے پلٹے۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ پیراڈائز پوائنٹ سے شہر کیسے پہنچے تھے۔" انسپکٹر نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میرے بہنوئی کے کہنے کے مطابق اسکی گاڑی میں۔" ندیم

نے کہا۔
ایک اور شخص کا کہنا ہے کہ اس نے بدھ کی شام کو سڑک پر سے ایک بے ہوش آدمی کو اٹھایا تھا جس کے کپڑے پانی میں تر تھے۔ وقت تھا تقریباً چھ بجے کا اور جگہ حادثے کے مقام کے قریب تھی۔ اس نے جو حلیہ بیان کیا ہے اس کے مطابق یہ شخص آپ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس شخص کا تحریری بیان نام اور پتہ لے لیا ہے وہ ایک غیر ملکی تیل کمپنی میں کیمسٹ ہے۔ کمپنی کی ساحل سمندر پر ایک بیٹ ہے۔ بیٹ کیا کوٹھی ہے۔ وہ وہاں اپنی ایک کزن کے ساتھ پکنک منانے گیا تھا اور وہ دونوں شہر لوٹ رہے تھے۔ اسکے پاس اوپل ریکارڈ کار ہے۔ اب آپ کا کیا خیال ہے؟" انسپکڑ مسکرایا۔ "آپ میٹروپول کیسے پہنچے تھے؟"

"دراصل" ندیم نے بے چینی سے پہلو بدلا "مجھے بے ہوش ہو جانے کے بعد کے واقعات کا قطعی علم نہیں میرے بہنوئی نے مجھ سے کہا کہ مجھے وہ لایا تھا تو میں نے اسکی بات مان لی۔ آپ کہتے ہیں مجھے کوئی اور لایا تو میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ مجھے تو صرف یہ یاد ہے کہ میں ریکس سینما کے قریب کھڑا تھا اور میرے کپڑے بالکل بھیگے ہوئے تھے اور مجھے اپنا نام اور پتا تک یاد نہیں تھا۔"

انسپکڑ چند لمحے اسے نظر جما کر دیکھتا رہا۔ "ندیم صاحب۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا ہے کہ ذکیہ کو تین ماہ کا حمل تھا۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ شادی شدہ عورت تھی۔"

"اس نے موت سے پہلے ایک بیان دیا تھا۔ کہ وہ آپ کو اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھتی ہے۔ وہ تم سے اس شام اس لئے ملنے گئی تھی کہ اسے تم سے کچھ کہنا تھا۔ وہ بار بار نیم بیہوشی کی حالت میں یہ کہتی رہی تھی کہ وہ بات ابا کو معلوم ہو گئی تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔"

"ابا کیوں قتل کر دیں گے؟" ندیم نے کہا۔ "کیا انہیں نواسے کے جائز نہ ہونے کا یقین تھا۔" ندیم نے طنزاً کہا۔

"جی ہاں" انسپکڑ نے اچانک کہا۔ "ان کا داماد یعنی ذکیہ کا شوہر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ تھا۔ شادی کے بعد وہ ذکیہ کو لے کر مری گیا تھا اور مری سے نتھیا گلی جاتے ہوئے بس ایک کھڈ میں گر گئی تھی۔ ذکیہ کا شوہر بری طرح زخمی ہوا تھا مگر مرا نہیں۔ ذکیہ کو معمولی زخم آئے تھے جب کہ حادثے میں مرنے والوں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ اس کے بعد سے ذکیہ نے شوہر سے طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا اور ..... اور وہ کچھ آزاد بھی ہو گئی۔ میاں بیوی کے تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ وہ بیشتر وقت گھر سے باہر یا باپ کے گھر میں گزارتی تھی۔ باپ کو صورت حال کا علم تھا لیکن وہ طلاق کا مخالف تھا پرانے خیال کا آدمی ہے۔ کہتا ہے میاں بیوی کو ہر حال میں زندگی بھر ساتھ نبھانا چاہیئے۔ اگر ایک معذور ہوتے ہی دوسرا الگ ہو جائے تو یہ شادی نہیں خود غرضی ہے۔ شوہر ذکیہ پر حاوی رہنے کے لئے اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا تھا۔ ذکیہ کے باپ کا بیان ہے کہ وہ انتہائی زود رنج حاسد اور ایذا پسند ہو گیا تھا۔"

ہر لفظ کے ساتھ ندیم کے ذہن میں ایک تصویر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ایک معذور مرد۔ ایک نوجوان عورت۔ ایک مرد کی انا۔ ایک عورت کے جذبات۔ ایک مرد کا جذبۂ انتقام۔ ایک عورت کے خواب۔ عظیم نے یہ جھوٹ ضرور بولا تھا کہ اسے شہر لانے والا وہ تھا لیکن اس نے ایک بات سچ بھی کہی تھی۔ ذکیہ نے ندیم شہزاد سے تعلقات کی داستانوں کو خود پھیلایا تھا۔ عمداً۔ اپنے خوابوں کی خود تشہیر کی تھی۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔ یہ حاسد شوہر کے نزدیک تذلیل تھی۔ اس نے ندیم سے کہا تھا تمہارے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ اس نے شاہینہ کے ساتھ اسے سمجھ کر اپنی کار ٹکرا دی تھی مگر غلطی کا احساس ہوتے ہی بھاگ گیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ساحل سمندر پر اس کار کو سڑک سے دھکیل کر سمندر میں گرانے والا بھی وہی ہو۔ وہ موٹر میکینک ہے۔ نہ جانے کس کی گاڑی لے آیا ہو گا اور عین اس وقت جب ندیم شہزاد اور ذکیہ کی کار موڑ کاٹ رہی تھی اس نے ٹکر مار دی۔ کار بے قابو ہو کر سمندر میں جا گری۔ کار کو اس نے مرمت کر لیا ہو گا۔ نہ بھی کیا ہو تو کیا۔ اسکے پاس تو گاڑیاں ایسی ہی آتی ہیں پچکی ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی۔ اسکی اپنی گاڑی کوئی بھی نہیں جو وہ پکڑا جا سکے۔

انسپکڑ نے اسکی پوری بات قطعی غیر سنجیدگی سے سنی۔ "یہ تو محض ایک مفروضہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نشے میں گاڑی کو سنبھال نہیں سکے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ذکیہ نے کپڑے کیسے پہن رکھے تھے؟"

ندیم چکرا گیا۔ "قمیض۔ غالباً پھولدار۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا قمیض تو لازمی ہے مگر ساڑھی بھی تو ہو سکتی ہے خیر قمیض کا رنگ؟ ڈیزائن؟ گریبان؟ نہیں۔ اسے کچھ یاد نہیں۔

"ٹھیک ہے" انسپکڑ نے کہا۔ "اور نیچے شلوار، غرارہ، بیل باٹم ....."

"میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے کچھ یاد نہیں" اس نے اعتراف کیا بہتر تھا۔ قمیض کا نام بھی اس نے بلاوجہ لے دیا تھا۔

"آپ کو یاد اس لئے نہیں ندیم صاحب کہ اس نے پیچھے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ اوپر صرف قمیض تھی۔ بغیر [illegible] بیلے اور نیچے پیلے پھولوں والی۔ اگر کھوئی ہوئی قمیض آپ کو [illegible] تو آپ کو باقی واقعات بھی یاد آ جانا چاہئیں ندیم صاحب [illegible] دلا۔

"انسپکڑ [illegible] کمال نے بےبسی سے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے میرے

"شادی کب ہوئی تھی؟"
انسپکٹر نے فائل سے نظریں اٹھائیں "۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء میرے ریکارڈ کے مطابق۔"

"کیا تمہارے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ ذکیہ سے میرے موکل کی ملاقات ڈیڑھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ ذکیہ نے اپنے بیان میں ندیم سے پہلی مرتبہ ملاقات کی تاریخ بتائی ہے جو ڈیڑھ مہینے پہلے کی ہے۔ لیکن ذکیہ تین ماہ سے حاملہ تھی۔" کمال نے کہا۔

"ہاں۔" انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا "آپ نے اپنے موکل کو قتل کے الزام سے تو تقریباً بچا لیا ہے۔ وہ قتل ان کے لئے نہیں رہی۔ اب میں ذکیہ کے شوہر کو طلب کرتا ہوں۔ آپ ندیم صاحب ضمانت قبل از گرفتاری تو آپ کرا چکے ہیں لیکن فی الحال شہر سے باہر نہ جائیں۔ تفتیش کے لئے آپ کو کسی وقت بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

○

"ندیم۔" پھوپھی رشیدہ نے چلا کر کہا۔ "اچھا ہوا تم آ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔" پھوپھی رشیدہ کے دہشت زدہ چہرے نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ "کیا بات ہے؟ کیا شاہینہ ...."

"نہیں۔" پھوپھی رشیدہ نے کانپتے ہوئے کہا۔ "خرم غائب ہے.... اسے کوئی اٹھا لے گیا ہے۔"

"کون۔؟" ندیم نے کہا۔ "کب اور کیسے۔"

"مجھے معلوم نہیں۔ میں نے تو بس ٹیلی فون اٹھایا تھا کہ اس نے کہا کہ خرم ہمارے پاس ہے۔ اسے لینا ہے تو شاہینہ سے کہو کہ دس ہزار روپے لے کر آ جائے۔ ہم ماری پور کے چوک پر گلبائی کے قریب کھڑے ہیں۔ شاہینہ اسی وقت کار میں رقم لے کر روانہ ہو گئی۔" پھوپھی رشیدہ نے بمشکل تمام بتایا۔

بے وقوف عورت۔ ندیم نے دل ہی دل میں شاہینہ کو مخاطب کیا اور گیراج کی طرف دوڑا۔ وہاں صرف ایک کار کھڑی تھی۔ گوہری سرخ فاکس ویگن۔ چابیاں گاڑی ہی میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے گاڑی کو گیٹ تک پہنچنے سے قبل ہی تیس کی رفتار پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے طاقتور انجن نے چند سیکنڈ میں یہ فاصلہ طے کیا تھا۔ یکلخت خرم گیٹ میں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فٹ بال تھی اور کپڑے ایسے ہو رہے تھے جیسے اس نے مٹی میں لوٹ لگائی ہے۔ بریک لگانے کے لئے نہ وقت تھا نہ جگہ تھی۔ اس نے اسٹیئرنگ دائیں جانب گھما کر بریک لگائی۔ گاڑی جھاڑیوں کو توڑتی ہوئی لان میں جا رکی۔ غصے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ "خرم" اس نے چلا کر کہا۔ "کہاں سے آ رہے ہو۔؟"

خرم سہم گیا۔ "میں.... انکل عظیم کے ساتھ فٹ بال کھیل رہا تھا وہ سامنے لان میں۔" اس نے اشارہ کر کے بتایا۔ "انکل عظیم؟" ندیم کے

شبہے پر جیسے خرم نے مہر تصدیق لگا دی۔ عظیم کو دس ہزار روپوں کی ضرورت تھی۔ اور ندیم نے بلیک میل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ذکیہ کے پڑوس میں رہتا تھا اور پوری صورتحال سے واقف تھا۔ ذکیہ کے شوہر کی فطرت کو سمجھتا تھا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ خرم کو بہلا کر اپنے ساتھ لے گیا اور اسے کھیل میں مصروف رکھا۔ ذکیہ کے شوہر نے "عظیم ہاؤس" فون کیا۔ اس کا مقصد تو شاہینہ کو بلانا ہو گا لیکن عظیم کے لئے دس ہزار روپے اہم تھے۔ چنانچہ اس نے ذکیہ کے شوہر کو وہ بہانہ فراہم کیا جس سے دونوں کے مقاصد پورے ہو جائیں۔ عظیم پر خرم کو اغوا کرنے کا الزام تک نہیں آیا اور شاہینہ ان کے جال میں پھنس گئی۔ ممکن ہے عظیم نے دس ہزار وصول کرنے کے بعد شاہینہ کو واپس بھیج دینے کا پروگرام بنایا ہو لیکن شاہینہ اب ذکیہ کے جنونی شوہر کے قبضے میں تھی۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر جھاڑیوں پر سے گزر کر گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔ طارق روڈ تک آٹھ میل کا فاصلہ اس نے ٹریفک سگنلوں اور رش کے باوجود پندرہ منٹ میں طے کیا۔ پہلے اس نے عظیم کو دیکھا۔ وہ اسنیک بار کے کاؤنٹر پر موجود نہ تھا۔ پھر اس نے مریم سے پوچھا۔ مریم کو بھی اس کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر کاؤنٹر پر موجود ہے۔ مزید وقت ضائع کرنے میں شاہینہ کی جان کو لاحق خطرات بڑھ جاتے تھے۔ وہ گاڑی کو عقبی گلی میں لے گیا۔ نیلی ڈاٹسن اپنی جگہ کھڑی تھی مگر ذکیہ کا فلیٹ مقفل تھا۔ ایک لمحے کے لئے اسکے اوسان خطا ہو گئے۔ اب وہ کیا کرے۔ اتنے بڑے شہر میں کدھر جائے۔ ذکیہ کے شوہر کا کیا ہے۔ وہ مرمت کے لئے آنے والی کوئی اور گاڑی لے گیا ہو گا۔ پھر اچانک بجلی کی طرح اسکے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ دیوانہ اسے وہیں لے جا کر مارے گا جہاں اسکی بیوی مری تھی۔ شاید عظیم کو بھی اس نے وہیں ملنے کیلئے کہا ہو گا اور عظیم نے مناسب یہی سمجھا ہو گا کہ دس ہزار وصول کر کے وہ شاہینہ کو یہ بھی بتا دے کہ یہ قیمت کس راز کی ہے۔

ایک بار پھر سڑکیں دوڑتی ہوئی گاڑی کے نیچے سے گزرنے لگیں۔ زن۔ زن۔ بجلی کے کھمبے بھاگتے ہوئے نکلنے لگے۔ پہیوں کی رفتار بڑھتی گئی۔ انجن کی غراہٹ گرج بن گئی۔ نہ جانے کہاں کہاں سگنل بند تھے مگر وہ گاڑی نکال لے گیا۔ ٹریفک کانسٹیبل کے سیٹی بجانے کی اور حادثے کو بچانے والے دوسرے ڈرائیوروں کی کاروں کے ہارن دینے کی ملی جلی آوازیں اسکے کانوں سے ٹکرائیں مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے بھاری بھرکم سفید رنگ کی ساڑھے سات ہارس پاور والی ہنڈا موٹر سائیکل چلانے والا کوئی سارجنٹ نہ ملا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ گلبائی جانے

والی سڑک کے دونوں جانب کارخانے تھے چنانچہ سڑک پر ٹریفک کم تھا۔ ماڑی پور کا چوک گزر گیا۔ ٹریفک اور کم ہو گیا۔ کارخانے ختم ہو گئے۔ نمک کے سفید ڈھیر شروع ہو گئے۔ سڑک دور دور تک خالی پڑی تھی۔ ٹول ٹیکس دینے کے لئے اس نے پانچ کا نوٹ نکالا اور کوپن لے کر باقی پیسے لئے بغیر گاڑی بڑھا دی۔

بالآخر سڑک پر ایک زرد دھبہ سا نظر آیا۔ اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ دھبہ لیمن کلر کی فاکس ویگن میں تبدیل ہو گیا۔ یہ عظیم کی کار تھی۔ اسے پیچھے سے دو سر نظر آنے لگے۔ ایک سر نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ شاہینہ کا سر تھا۔ ساحل پر بنے ہوئے مکانات کی قطار نمودار ہو گئی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے رہیں۔ فاصلہ کم ہوتا گیا مگر سڑک بہت خراب تھی۔ ان میں سے کسی کا بھی بچاس سے اوپر جانا خطرناک تھا۔ خیر ندیم نے سوچا۔ اب وہ شاہینہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میل پہ میل گزرتے گئے۔ مکانوں کی قطار کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ چٹانیں شروع ہو گئیں۔ تب اچانک اسے احساس ہوا کہ اسکی محنت اکارت گئی۔ شاہینہ کو بچانے کی جدوجہد رائگاں گئی کیونکہ اسکا مقابلہ ایک جنونی سے تھا مارنے کے علاوہ مرجانے سے بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جیسے جیسے وہ موڑ قریب آتا گیا اسکا حوصلہ جواب دینے لگا۔ مایوسی کے ایک لمحے نے اسے گرفت میں لے لیا۔ دوسرے لمحے آگے والی کار نے دائیں جانب موڑ کاٹا مگر سڑک پر رہنے کی بجائے کچے راستے پر اتر گئی۔ "شاہی" وہ چلایا اور اس نے چاہا وہ اپنی آنکھیں بند کر لے مگر اتنا وقت بھی کہاں تھا کہ وہ آنکھیں بند کرتا۔ اگلی کار چٹان پر چڑھی اچھلی اور غائب ہو گئی۔ اس نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ پانی میں ایک زبردست چھپاکا ہونے کی آواز آئی اور وہ گاڑی سے اتر کر دیوانہ وار دوڑا۔ چٹان کے آخری کنارے سے اس نے جھانکا۔ نیچے صرف موجیں تھیں جو پتھروں پر سر پٹخ رہی تھیں۔ اس نے قدم جمائے اور چھلانگ لگا دی۔ اسکا جسم پانی کی سطح سے ٹکرایا اور سمندر کے پانی کا نمکین ذائقہ اسے اپنی زبان پہ محسوس ہوا۔

"ذکیہ" وہ چلایا۔ "ایسے دروازہ نہیں کھلے گا" جواب میں اس نے ذکیہ کی چیخ سنی۔

"بے وقوف۔ باہر پانی کا دباؤ ہے۔ جب تک اندر بھی پانی نہیں بھر جائے گا۔ ذکیہ۔ ذکیہ"

"نہیں" وہ تو شاہینہ کو ڈھونڈ رہا ہے۔ شاہینہ یا ذکیہ۔ اندھیرا۔ اور پانی کے اندر وہ آہنی قبر۔ ذکیہ خدا کے لئے۔ مگر ذکیہ پاگل ہو گئی ہے۔ وہ شیشے سے سر ٹکرا رہی ہے۔ شیشہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔ بے وقوف۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ باہر پانی کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔ اسکے ہاتھ کار کی باڈی سے ٹکرائے۔ ہاں۔ باہر سے ٹکر مار کے وہ پانی کی قوت کا ساتھ دے سکتا ہے۔ شیشہ بغیر آواز کے ٹوٹ گیا۔

"شاہینہ" اس نے چلا کے کہا۔ "دروازے کا ہینڈل لاک کھولو" کار میں پانی جا رہا تھا مگر آواز کوئی نہ تھی۔ اس نے خود ہی ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈالا۔ پھر دروازہ کھل گیا اور شاہینہ کا جسم اس کے ہاتھوں میں آگیا۔ نہیں وہ ذکیہ کو نہیں مرنے دے گا۔ وہ ذکیہ کو بچا لے گا۔ مگر ذکیہ تو مر چکی ہے۔ اس نے تو بہت کوشش کی تھی اسے بچانے کی۔ . . کیا وہ شاہینہ کو بھی بچا سکے گا . . . نہیں اس بار وہ گھبرائے گا نہیں۔ حوصلہ نہیں ہارے گا۔ شاہینہ . . . شاہینہ . . . پانی اسکے حلق سے جا رہا ہے مگر وہ اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔

اچانک اس نے دن کے اجالے میں آنکھ کھولی۔ وہ حیران رہ گیا۔ جب اس نیلی کار نے ٹکر ماری تھی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور اس نے ذکیہ سے کہا تھا کہ ہیڈ لائٹس جلائے مگر وہ بہت خوف زدہ تھی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس وقت تو دن ہے۔ وہ رات کی بات تھی۔ اس رات کی جب ذکیہ اسکے ساتھ تھی۔ شاہینہ نہیں، اور وہ اس سرخ فاکس ویگن میں نہیں تھا۔ اسکے پاس اسکی اپنی گاڑی تھی۔ ٹویوٹا۔ رفتار تو اسکی زیادہ نہیں تھی مگر اس نیلی کار نے اسے ٹکر مار دی تھی اور توازن بگڑ گیا تھا۔ اسٹیرنگ ذکیہ کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اور گاڑی ایک دم گھوم گئی تھی۔ ہاں۔ اسے اب ہر بات یاد آگئی تھی۔ جگہ یہی تھی۔ حادثہ بھی یہی تھا۔ بس اسکے ساتھ ذکیہ نہیں شاہینہ تھی۔ وہ ذکیہ کو نہیں بچا سکا تھا۔ مگر اس نے شاہینہ کو بچا لیا تھا۔ ذکیہ کا دیوانہ شوہر اپنے ہی جنون کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ چٹان پر کھڑا تھا۔ پانی میں شرابور کپڑوں سمیت۔ شاہینہ کو اٹھائے۔ پھر جیسے دن کا اجالا اندھیرے میں ملنے لگا۔ وہ لڑکھڑایا اور گر گیا۔

❀

خواب . . . خواب . . . سراب اور خواب . . . فلم [illegible] میں سے بار بار ٹوٹ جاتی ہے۔ سارے منظر و صدے [illegible] . . . کہیں کوئی ربط نہیں . . . سارے چراغ روشن ہیں مگر اندھیرا پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔

"تمہاری ٹویوٹا تو بہت شاندار ہے" ذکیہ ہنسی "بڑا مزا آتا ہو گا اسے چلانے میں تو۔ . ."

"ذکیہ۔ تم کیا کر رہی ہو میری کار میں" کار میں تو [illegible]

جبری بھرتی کا نظام دنیا کے جس ملک میں بھی رائج ہے، وہاں کے لوگ اس سے عاجز ہیں۔ خاص طور پر نوجوان تو فوج کی طرف سے اس سلسلے میں موصول ہونے والے خطوط سے بہت ہی گھبراتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نوجوان کو جب طلبی کا خط ملا تو اس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔ دوست نے کہا: "تم یوں کرو۔ اپنے سارے دانت نکلوا دو۔ اس طرح طبی بنیادوں پر فوج کی ملازمت کے لئے نا اہل قرار دیئے جاؤ گے۔"

نوجوان نے اس مشورے پر عمل کیا اگلی مرتبہ اس کے دوست نے ملاقات پر پوچھا۔ "کہو۔ میرا مشورہ کام آیا۔؟"

"انہوں نے مجھے نا اہل قرار دے دیا۔" نوجوان نے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا۔" دوست نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں۔ لیکن پوپلے منہ کی وجہ سے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میری ٹانگیں ٹیڑھی ہیں، اس لئے میں فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔!"
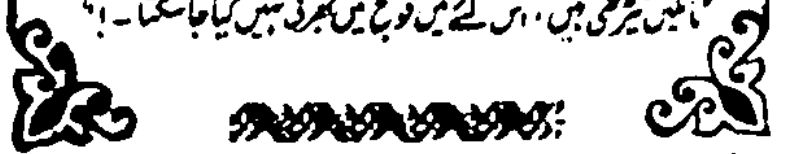
لگی جا رہی ہیں۔ لوگ آتے جا رہے ہیں۔

"کچھ نہیں۔ مزے لے رہی ہوں۔ آؤ تم بھی بیٹھو۔ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"دیکھو ذکیہ۔ میں ماتحتوں کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آتا ہوں اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو کر بدتمیزی پر اتر آئیں۔" وہ اسکے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم دفتر میں بھی مجھ سے بلاوجہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی ہو اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔"

"اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔" وہ ہنسی۔ "اب تو تم میرے بچے کے باپ بننے والے ہو۔"

اسکا ہاتھ ذکیہ کے رخساروں پر پڑا۔ "گیٹ آؤٹ۔ کل سے [illegible] پر آنے کی ضرورت نہیں۔"

ندیم صاحب۔" وہ بولی۔ "آپ نے شاید غور نہیں کیا۔ میں [illegible] کچھ نہیں بہن رکھا۔ آپ کو بہت سے لوگ یہاں مجھ سے [illegible] تے دیکھ چکے ہیں۔ میں شور مچا کے سب کو اکٹھا کر لوں گی۔"

وہ ڈر گیا۔ ذکیہ کی ٹانگیں ڈیش بورڈ کے نیچے تھیں۔ باہر سے کسی کا [illegible] دیکھنا مشکل تھا لیکن اسکے ساتھ بیٹھا ہوا وہ دیکھ سکتا تھا کہ ذکیہ [illegible] غلط نہیں کہا۔ وہ نشے کے باوجود صورت حال کو سمجھ گیا۔ "تم [illegible] کیا ہو۔" [illegible] نے کہا۔ ذکیہ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گیٹ پر [illegible] چوکیدار نے [illegible] سلام کیا اور وہ ذکیہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ باہر نکلتے ہی اس نے گاڑی [illegible] لیا مگر اس نے رفتار بڑھا دی۔

"ندیم کیا میں اتنی ہی بری ہوں کہ تم ایک شام بھی میرے ساتھ نہیں گزار سکتے۔" وہ بولی۔ "میں تم پر مرتی ہوں۔ میں نے ساری دنیا کو یہ بات بتا دی ہے۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اپنے اس نامرد شوہر کا بھی۔"

"شٹ اپ۔" وہ بولا۔ "میرے گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں اس وقت کہیں نہیں جا سکتا۔" گاڑی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ ذکیہ کی پوزیشن ایسی تھی کہ اگر وہ زبردستی کرتا تو گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا اور وہ ذکیہ کے ساتھ اس حالت میں سڑک پر پکڑا جاتا۔ "تم پاگل ہو گئی ہو ذکیہ۔ تم سمجھتی ہو کسی کا گناہ کسی کے سر منڈھنا یا اس بہانے کسی کو بلیک میل کرنا آسان ہے۔"

اس نے کہا۔ "یہ بچہ کس کا ہے؟"

"اپنا ہی سمجھو۔" وہ بولی۔ "دنیا کے سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تم میں اور عظیم میں کیا فرق ہے؟"

"عظیم۔" وہ بھونچکا رہ گیا۔ "کون عظیم... مریم کا شوہر؟"

"ندیم۔" وہ اچانک چلائی۔ "وہ... وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے... وہ..." اس نے ہکلا کر کہا۔ ان کے پیچھے ایک کار کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ ندیم نے سر نکال کے دیکھا۔ نیلے رنگ کی ایک پرانی ڈاٹسن ان کے تعاقب میں تھی۔ "کس کی کار ہے یہ؟" اس نے ذکیہ کی طرف دیکھا۔ وہ سخت خوفزدہ تھی۔ "ہیڈ لائٹ جلالو۔ اور گاڑی کو موڑ لو۔ اگر کوئی ہمارے پیچھے ہے تو میں نمٹ لوں گا اس سے۔"

"نہیں۔ وہ... وہ میرا شوہر ہے... وہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے قتل کر دے گا۔" ذکیہ نے دہشت زدہ ہو کر کہا اور ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ ساٹھ... ستر... اسی.. ذکیہ ذکیہ... ساحل کے ہٹ گزرتے جا رہے ہیں۔" ذکیہ سنبھل کے گاڑی قابو سے باہر ہو رہی ہے۔" اس نے بریک پر پیر رکھ دیا۔ نیلی ڈاٹسن نے بائیں جانب سے اوورٹیک کرتے ہوئے ٹکر ماری۔ ذکیہ نے گاڑی کو دائیں جانب موڑا ہی تھا کہ اسٹیرنگ اسکے ہاتھ سے نکل گیا۔ گاڑی چٹان پر چڑھ گئی۔ ایک پتھر سے ٹکرائی۔ اچھلی اور اوندھے نیچے جا گری... اندھیرا اسکے گرد مسلط ہو گیا۔

"شاہینہ۔" وہ چلایا اور اٹھ بیٹھا۔ "میں نے اسے نہیں مارا... میں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی... خدا کی قسم... تمہاری قسم..." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا... وہ اپنے گھر کی خوابگاہ میں تھا۔ قصرِ اعظم میں۔ اس نے خود کو پہچان لیا تھا... صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا تھا... شاہینہ نے اسے سنبھال لیا... اپنی آغوش میں لے لیا۔

ooo